عکسِ بے خیال
رشید امجد

aaks e be khayal

# عکسِ بے خیال

رشید امجد

بچھڑ کے دِل تِری گلیوں سے پائمال ہُوا
ہر ایک خواب مِرا، عکسِ بے خیال ہُوا

—— اشرف سلیم

AKS-E-BEKHAYAL [SHORT STORIES]
BY: RASHEED AMJAD PRICE Rs. 75/-

# عکسِ بے خیال

رشید امجد

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹، گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دھلی ۲-۱۱۰۰

اشاعت ۱۹۹۶ء

قیمت : پچھتر روپے

طباعت : اے ون آفسیٹ پریس، دہلی۔

سرورق : رزاق ارشد

زیرِ اہتمام :

پریم گوپال مِتّل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

# ترتیب


ایک نسل کا تماشا ——— ۷

ایک کہانی اپنے لیے ——— ۱۴

دل زندہ رہے ——— ۲۲

ہوا کے پیچھے پیچھے ——— ۲۸

منظر سے باہر خوشبو ——— ۳۵

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا ——— ۴۰

سفر جس سے واپسی نہ ہوئی ——— ۴۷

دل دریا ——— ۵۴

تسلسل ——— ۵۷

ایک گمنام سیاح کی ڈائری کے چند اوراق ——— ۶۱

بے خوشبو عکس ——— ۶۶

بیکسیِ پرواز ——— ۷۲

عکسِ بے خیال ——— ۷۶

جلیل عالی

کے نام

# ایک نسل کا تماشا

مجھے معلوم نہیں کہ میرا اس کہانی سے کیا تعلق ہے اور یہ کہانی کس نے مجھے سنائی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اس کہانی کے ایک ایک منظر سے واقف ہوں اور اس لمحے کو بھی دیکھ سکتا ہوں جب ایک روز گزرتے ہوئے بادشاہ کی نظر ایک درویش پر پڑی۔ بادشاہ نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور درویش کو مخاطب کر کے کہا ______ ''اے شیخ کیا تو جانتا ہے کہ میں شاہِ وقت ہوں؟''

درویش نے یہ سن کر خندہ کیا،

بادشاہ نے پوچھا ______ ''تم ہنسے کیوں؟''

درویش بولا ______ ''تیری کم عقلی اور تیرے جہل اور تیرے نفس اور تیرے حال پر''۔

یہ سن کر بادشاہ پر ایسی کپکپی طاری ہوئی کہ وہ رونے لگا اور گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ وہیں کھڑے کھڑے بادشاہی سے ہاتھ کھینچا اور درویش کی خدمت میں داخل ہو گیا۔ تین روز تک درویش نے اسے اپنی پناہ میں رکھا، تیسرا دن گزرنے پر اس کے لیے تھوڑی سی رسی کا بندوبست کیا، اور کہا ______ ''اے شخص مہمانی کے دن پورے ہو گئے، اب لکڑی کاٹنے کا کام کر،

درویش کے حکم کے مطابق بادشاہ، جو اب ایک عام شخص تھا، اس کام میں مشغول ہوگیا۔ لکڑیوں کا گٹھڑ سر پہ دھر کے بازار میں آیا۔ لوگ اسے دیکھتے اور روتے تھے۔ اُس نے گٹھڑ بیچا اور اس کے مول میں سے اپنی روکھی سوکھی کے لیے کچھ گرہ میں ڈالا اور باقی صدقہ کیا۔

اب یہی معمول ٹھہرا اور یونہی یہ درویش بادشاہ دربدر کی خاک چھانتا ایک روز خود رزقِ خاک ہوا۔ بعد ایک مدت کے اسی خاک سے ایک اور درویش نے جنم لیا اور صدیوں کی مسافتیں طے کرتا اس شہرِ ناپرساں میں وارد ہوا۔ جب روز وہ شہر کی فصیل سے اندر آیا، اتفاق سے وہی دن تھا جب اس شہرِ ناپرساں کا بادشاہ جلوس کرتا شہر کی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ درویش بھی ایک طرف کھڑا ہوگیا، بادشاہ کی نظر اس پر پڑی تو پوچھا ________ "اے شخص تو نووارد لگتا ہے اور صورت سے فقیر دکھائی دیتا ہے، کیا تو جانتا ہے کہ میں شاہِ وقت ہوں"؟

درویش ہنسا،

بادشاہ نے پوچھا ________ "تو ہنسا کیوں"؟

درویش نے کہا ________ "حالات کے تغیّر پر کہ جو بادشاہ تھا، وہ حقیقت آشنا ہو کر فقیر بنا اور فقیر نے اپنا منصب کھویا تو بادشاہ ہوا"۔

یہ سن کر بادشاہ کو غصہ آگیا اُس نے حکم دیا کہ درویش کو شہر کے بڑے چوراہے میں کوڑے لگاتے جائیں تاکہ وہ جان لے کہ بادشاہ کون ہے اور فقیر کون؟

شہر کے بڑے چوراہے میں ٹکٹکی پہلے سے موجود تھی، درویش کو وہاں لائے۔ تماشا دیکھنے کو سارا شہر اُمڈ آیا کہ شہر کے لوگ تماش بین تھے خود بھی تماشا بنتے اور دوسروں کو بھی تماشا بناتے۔

یہ روز کا معمول تھا کہ اس بڑے چوراہے میں کسی ایک کو کوڑے لگائے

جاتے ، ہجوم میں سے آدھے خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے اور آدھے افسوس کرتے افسوس کرنے والوں میں ، میں بھی شامل ہوں ، لیکن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ تماشا ہے کیا ؟

"تمہیں معلوم ہے ؟" میں ساتھ والے سے پوچھتا ہوں

وہ خالی نظروں سے مجھے دیکھے جاتا ہے ، پھر کندھے اُچکاتے ہوئے کہتا ہے ـــــــ "بس یہ ایک تماشا ہے ، ایک منظر اور ہم سب اس کا حصہ ہیں وہ جو ٹکٹکی پر بندھا ہے اور ہم جو یہ سب دیکھ رہے ہیں"۔

"تو کیا دیکھتے جانا ہی ہمارا مقدّر ہے ؟"

بس دیکھتے جانا ـــــــ لیکن میں صرف دیکھنا نہیں چاہتا کچھ جاننا بھی چاہتا ہوں ۔

"شُشش" ـــــــ وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے ـــــــ "خاموش رہو ـــــــ دیکھنے سے آگے جاننے کی حد شروع ہوتی ہے "۔

ایک بادشاہ نے اپنے غلاموں سے کہا کہ ایک مہمان آنے والا ہے تم سونے کا ایک ایک پیالہ پکڑے کھڑے رہو ۔ ایک غلام اس بادشاہ کا خاص مُقرب تھا اُسے بھی حکم دیا کہ ایک پیالہ پکڑے ۔ جب بادشاہ نے صورت دکھائی تو وہ خاص غلام بادشاہ کے دیدار سے بے خود و سرمست ہو گیا ۔ پیالہ اس کے ہاتھ سے جا گرا اور ٹوٹ گیا ۔ دوسرے غلاموں نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ شاید ایسا ہی کرنا چاہیئے ۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے پیالے زمین پر دے مارے اور توڑ ڈالے ۔ بادشاہ سخت برہم ہوا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی ؟ وہ بولے جہاں پناہ کے مقرب خاص نے ایسا کیا تھا ۔ بادشاہ بولا ، بے وقوفو وہ اُس نے نہیں میں نے کیا تھا ۔

یہ سارا شہر ایک عجب سرمستی کے عالم میں ہے، میلے پر آئے ہوئے شخص کی طرح ________ ہر طرف ایک میلہ ہے، ٹکٹکی کے گرد بھی میلہ ہی ہے اسی میلے کی ہو ہاؤ میں درویش کو ٹکٹکی سے اتارا گیا۔ بہت سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ایک نے پوچھا ________ "ہمیں بتاؤ ہمیں کیا ہو گیا ہے"

درویش نے کہا ________ "تمہیں نسیان ہو گیا ہے اور سارا شہر ہی شہر نسیان ہے"۔ پھر درویش نے انہیں ایک حکایت سنائی،

ایک قافلہ رات کے گھپ اندھیرے میں جنگل میں سفر کر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ چلتے رہے اور اپنے اپنے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال کر ایک دوسرے کو اپنے ہونے کا احساس دلاتے رہے۔ صبح ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے درمیان ایک خونخوار جانور بھی موجود ہے۔ اُسے دیکھ کر خوف سے ان کے قدم رک گئے اور آوازیں بند ہو گئیں۔ وہ اس کے سامنے ساکت و جامد ہو گئے۔

یہ حکایت سن کر اُن میں سے ایک نے سر اٹھایا ________ "تو یہ خواب نہیں حقیقت ہے"۔

اور یہ سارا تماشا رات کا ہے۔ رات تو اپنے اندھیرے میں شکلیں بدل دیتی ہے کیا معلوم وہ خونخوار جانور انہی میں سے کسی ایک کی بدلی ہوئی صورت ہو اور ایک ایک کر کے وہ سارے ہی اسی طرح کے جانوروں میں بدل جائیں۔

میرا نام کیا ہے ________ میں کون ہوں؟

ایک شخص راستہ بھٹک کر ایک بیابان میں جا نکلا بھوک اور پیاس

سے اس کی حالت بُری تھی۔ اتنے میں ایک خیمہ دکھائی دیا۔ مارامار وہاں پہنچا تو ایک عورت دکھائی دی مسافر نے اس سے پانی مانگا۔ عورت نے مسافر کو پانی دیا جو آگ سے زیادہ گرم اور نمک سے زیادہ کھاری تھا۔

ہونٹوں سے گلے تک جہاں سے پانی گزرا سب کچھ جلتا گیا۔ مسافر نے بڑی شفقت سے عورت کو کہا ——— تم نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ میرا خیال ہے کہ شہر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہوگا۔ تم نے خود کو اس جگہ کیوں مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اگر کسی طرح راستہ تلاش کر کے وہاں پہنچ جاؤ تو وہاں میٹھا اور ٹھنڈا پانی ملے گا اور طرح طرح کی نعمتیں بھی میسر آئیں گی۔ اتنے میں اس عورت کا شوہر آگیا۔ وہ چند جنگلی چوہے شکار کر کے لایا تھا اس نے عورت سے کہا کہ انہیں پکائے اس میں سے انہوں نے کچھ مسافر کو بھی دیے۔ مسافر مصیبت کا مارا بھوکا تھا مجبوراً انہیں بھی کھا گیا اور خیمہ سے باہر سو رہا۔ عورت نے اپنے شوہر سے کہا ——— تم نے سنا اس مسافر نے شہر کی کیا کیا تعریفیں کیں اور کیا کیا قصے سنائے پھر وہ تمام گفتگو جو مسافر نے کی تھی خاوند کے سامنے دہرائی۔ خاوند نے سب کچھ سن کر کہا "——— ٹھیک ہے وہاں میٹھا پانی اور لذیذ کھانا ملتا ہے لیکن انسان انسان نہیں رہتا۔"

"کیا مطلب؟" عورت نے پوچھا

"وہ جانور بن جاتا ہے ——— خونخوار جانور"

جنگل میں ایک میلہ ہے۔ جس میں ہر طرف ہو ہا کی آوازیں گونج رہی ہیں کان پڑی صدا سنائی نہیں دیتی۔ چہرے کون یاد رکھے، اور نام کون جانے ——— کوڑا لہراتے ہوئے ایک آتا ہے۔ اپنے ہونے کا احساس کراتا ہے، پھر دوسرا ——— اس کے بعد تیسرا اور یہ سلسلہ ——— کون بادشاہ ہے کون درویش ہے کبھی بادشاہ

درویش بن جاتا ہے اور کبھی درویش بادشاہ کیا کریں، کس کی سنیں کس کے ساتھ چلیں؟

یہ تماشا ایک نسل کا ہے یا کئی نسلوں کا؟

جواب اگر کسی کے پاس ہے تو وہ بولتا نہیں۔ بس اُمڈتی اندھیری رات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی رضا گھُٹّی میں پڑ چکی ہے تو پھر ایسی صورت میں چند لمحوں کے لیے سر اٹھا بھی لیا تو کیا اور نہ اٹھایا تو کیا؟

ایک شیر نے ایک ہرن کا پیچھا کیا۔ ہرن بھاگ کھڑا ہوا اس وقت دو ہستیاں تھیں، ایک شیر اور دوسرے ہرن، لیکن جب شیر نے اُسے جا لیا اور وہ شیر کے پنجۂ اجل میں آ گیا تو شیر کی ہیبت نے اسے بے ہوش کر دیا اور وہ بے خود ہو کر شیر کے سامنے گر گیا، اس لمحہ صرف شیر ہی ایک ہستی باقی رہ گیا۔

ایک لمحہ آیا، گزر گیا۔

کہتے ہیں زمین میں ایک چھوٹا سا حیوان ہے جو زمین کے نیچے زندگی بسر کرتا ہے اور ظلمت میں رہتا ہے اس کی آنکھ اور کان نہیں ہیں، اس لیے کہ جہاں وہ رہتا ہے وہاں آنکھ اور کان کی ضرورت نہیں، تو پھر جب اُسے آنکھ اور کان کی ضرورت ہی نہیں تو اُسے آنکھ اور کان کیوں دیے جائیں۔

اس جنگل کے میلے میں آنکھ اور کان کی ضرورت کا احساس ہے بھی کیسے؟

درویش سر نیوڑائے ٹکٹکی کے نیچے بیٹھا ہے۔ اس کے نتھنوں میں بادشاہ کے دستر خوان کی گرم گرم خوشبو ٹلکورے لیتی ہے۔

"میرا مقام بادشاہ کا دستر خوان ہے یا یہ ٹکٹکی" وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

دفعتہً اسے اپنے آپ سے گھن سی آتی ہے،

"تُف ہے مجھ پر کہ میں گرم خوشبوؤں کے حصار میں پھنس گیا۔ میرا

مقام شاہی دسترخوان نہیں یہ ٹکٹکی ہے"

کہتے ہیں اُسی رات درویش نے شہر چھوڑ دیا۔ صبح بادشاہ کے جی میں جانے کیا آیا کہ بھرے دربار میں تخت سے اترا، شاہی چغہ اتار کر اپنے اجداد کا خرقہ پہنا اور ٹکٹکی کے پاس آبیٹھا۔

آگے کی کہانی مجھے معلوم نہیں، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا اس کہانی سے کیا تعلق ہے اور یہ کہانی کس نے مجھے سنائی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اس کہانی کے ایک ایک منظر سے واقف ہوں اور درویش اور بادشاہ دونوں کو اسی طرح جانتا ہوں جیسے اپنے آپ کو۔

# ایک کہانی اپنے لیے

زندگی کے طویل خارزار میں وہ مجھے چند لمحوں کے لیے ملتی ہے، اور اُس کے بعد اداسی کی لمبی شاہراہ ہے۔ جس پر میں اکیلے ہی سفر کرتا ہوں، یہ چند لمحوں کی ملاقات ہی اس طویل خارزار میں میرا زادِ راہ ہے۔ مجھے لگتا ہے میری زندگی ایک نہ ختم ہونے والی اداس شام ہے۔ جس کے زرد جھروکوں سے وہ کبھی کبھی، چند لمحوں کے لیے نمودار ہوتی ہے اور اپنے پیچھے ایک اداسی چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون ہے؟ اور اس کے کتنے روپ ہیں میں نے تو اُسے ہمیشہ ایک نئے روپ ہی میں دیکھا ہے۔

الگ الگ صورتوں، جدا جدا شکلوں میں،

لیکن ان سب کے پیچھے وہ ایک ہی ہے، وہی مجھے اداس کر دینے والی، جس کا کوئی نام نہیں، کئی نام ہیں۔

اس کا مجھ سے ملنا بھی عجیب ہے اور جُدا ہونا بھی عجیب،

ان دونوں کا درمیانی وقفہ کبھی کبھی تو چند لمحوں کا ہوتا ہے۔ اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ میری زندگی کی راہداری کے ایک سرے سے داخل ہوتی ہے اور تیز تیز چلتی دوسرے سرے سے نکل گئی ہے اُس کے آنے اور جانے

کا احساس مجھے اُس اداسی سے ہی ہوتا ہے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے ——
—— لیکن کبھی کبھی مہینوں کیا برسوں بیت جاتے ہیں اور میری اس سے ملاقات
نہیں ہو پاتی۔ اور یہ برسوں بعد ہی کی بات ہے، بلکہ یوں لگتا ہے صدیاں بیت گئی ہیں
بس اُس شام وہ اچانک ہی مل گئی۔ میں ایک دوست کی شادی میں
گیا تھا۔ واپسی پر اُس نے مجھ سے کہا کہ ایک صاحبہ کو راستے میں اتارتے جانا۔ میں نے
کہا —— "ٹھیک ہے مجھے اُدھر ہی جانا ہے"
چند لمحوں بعد وہ آ گئی —— میں نے اُسے پہچانا نہیں۔
جب گاڑی گلی سے نکلی تو وہ بولی —— "سُنا ہے آپ کہانیاں
لکھتے ہیں"؟
میں نے سر ہلایا۔
"مجھے بھی بڑا شوق ہے، لیکن میں لکھتی نہیں، بس پڑھتی ہوں"
"لکھتی کیوں نہیں"؟
"بس" —— اُس نے عجب شانِ بے نیازی سے سر ہلایا چند
لمحے خاموش رہی، پھر بولی —— "جب آدمی کوئی کہانی پڑھتا ہے تو اُس
میں بس جاتا ہے"۔
اس کے لہجہ میں عجب طرح کی اداسی تھی، بس اُسی لمحے میں نے اُسے
پہچان لیا لیکن میں اُسے بتا نہ سکا نہ یہ پوچھ سکا کہ اتنا عرصہ وہ کہاں رہی —— میں تو
کبھی اُسے نہیں بتا سکا کہ میں اُسے پہچان سکتا ہوں اور نہ کبھی یہ پوچھ سکا کہ میرا اُس کا کیا رشتہ ہے؟
اس لمحے بھی جب وہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی عجب شانِ بے نیازی سے
مجھے دیکھے جا رہی ہے،
"آپ اور کیا کرتے ہیں"؟ اُس کے سوال نے مجھے چونکایا۔

اُس کی سوالیہ نظریں جانے کب سے میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"پڑھاتا ہوں"

"اچھا ——————" اُس نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو

پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی، اور میرا تو ازل سے اس کے سامنے یہی حال رہا ہے کہ زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ میں تو اُسے آج تک کچھ بھی نہیں بتا پایا، لیکن بتانے کے لیے ہے بھی کیا؟

"آپ کے کتنے بچّے ہیں" وہ پھر سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔

"نہیں"

"اچھا" —————— اس اچھا میں نہ حیرت تھی نہ کوئی اور جذبہ"

"اور آپ کیا کر رہی ہیں؟" میں نے بڑی جرأت سے پُوچھا۔

"بی اے کا امتحان دیا ہے، نتیجے کا انتظار کر رہی ہوں"

"پھر کیا کریں گی"؟

"شاید ایم اے کر لوں —————— آپ کے یہاں ایم اے کی کلاسیں ہیں نا"

مجھے معلوم نہیں میں نے کیا کہا —————— یاد آیا کئی برس پہلے وہ اسی طرح مجھے ملی تھی، کلاس کی سب سے اگلی سیٹ پر، پہلے ہی دن میں نے اُسے پہچان لیا تھا، لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکی۔ دو سال یوں گزر گئے جیسے لمحوں کو پر لگ گئے ہوں۔ آخری دن جب الوداعی تقریب ہو رہی تھی، وہ میرے پاس آئی۔ اُس کے ہاتھوں میں سرخ گلاب تھا۔

اُس نے کہا —————— "سر اگر آپ بُرا نہ منائیں تو میں یہ پھول آپ کے کالر میں لگا دوں"

میں کچھ نہ بولا ——— بس یہ سوچتا رہا کہ آخر اُس نے مجھے پہچان ہی لیا، لیکن دو سال کیوں خاموش رہی؟

پھول لگاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس کے بعد وہ مجھے نہیں ملی لیکن اس کی بھیگی آنکھیں اب بھی میرے ساتھ ہیں۔

اس لمحے جب وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے ——— "اگر میں پاس ہو گئی تو داخلہ مل جائے گا"۔

اس کی آنکھوں میں وہی اپنائیت، وہی بھیگا پن ہے۔

برسوں پہلے یہی بھیگا پن اُس وقت بھی اس کی آنکھوں میں تھا جب میں پہلی بار اپنی بیوی کے ساتھ اس کے گاؤں گیا تھا۔ گاؤں میں کسی عزیز کی شادی تھی۔ میری بیوی اور دوسرے لوگ ساتھ والی بڑی حویلی میں تھے مجھے باہر کی طرف کھلنے والے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔

میں اپنے ساتھ ایک نئی کتاب لے گیا تھا اور اسی میں منہمک تھا کہ آواز آئی ———

"آپ چائے تو نہیں پئیں گے؟"

میں نے چونک کر سر اٹھایا، وہ دہلیز پر کھڑی تھی۔

"جی ———"

"شہر کے لوگ چائے بہت پیتے ہیں نا" ——— وہ کھلکھلائی۔

"اگر آپ کہیں تو آپ کے لیے چائے بنا لاؤں"۔

"جی ———" میں بوکھلایا ہوا تھا

"اچھا بنا لاتی ہوں" ——— وہ دہلیز کے پار اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ میری بیوی کی رشتہ دار

ہے۔ اُس نے کہا ——— "آپ تو مجھے نہیں جانتے، لیکن میں آپ کو پہچانتی ہوں' میں باجی کی شادی میں بھی آئی تھی"۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ میں تو اُسے صدیوں سے جانتا ہوں۔ وہ ہمیشہ یونہی میری زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر چند لمحوں کے لیے مجھ سے بات کرتی ہے اور پھر وقت کے سرابوں میں کہیں گم ہو جاتی ہے۔

وہ کہہ رہی تھی ——— "میں آپ کی کہانیاں بھی پڑھتی ہوں"۔

"اچھا" ——— میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

کہنا تو چاہتا تھا کہ کبھی مجھے بھی پڑھ لو، میں ایسی کہانی ہوں جو صرف اسی کے لیے ہے، لیکن یہ بات تو میں اس وقت بھی اس سے نہ کہہ سکا جب وہ میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ پورے دو برس ہم ایک ہی کلاس میں رہے روز ملتے، نوٹس تبدیل کرتے۔ گھنٹوں کورس کی باتیں کرتے لیکن ان دو برسوں میں، میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ میں اُسے پہچان گیا ہوں، اور نہ یہ پوچھ سکا کہ اُس نے بھی مجھے پہچانا ہے یا نہیں۔

آخری دن جب سب ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے اس نے مجھے کہا ——— "معلوم نہیں زندگی کی شاہراہ پر کبھی دوبارہ مل پائیں یا نہیں، لیکن میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی"۔

اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ یہ بھیگی آنکھیں ہی تو میرا سرمایا ہے میں اس سرمائے کو برسوں سے سنبھالے پھر رہا ہوں۔ اس ملنے سے جب میری عمر سات سال تھی۔

ہم صبح راولپنڈی جا رہے تھے۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ملاقات کے لیے آئی تھی۔ اس کے ابّو میرے والد کو اب بھی سمجھا رہے تھے کہ سرینگر چھوڑ کر نہ جاؤ۔

میرے والد بڑے یقین سے کہہ رہے تھے "بس چند دنوں کے لیے

جا رہا ہوں میری بہن امرتسر سے وہاں آگئی ہیں۔ ان سے ملنا ضروری ہے"۔

اس کے والد بولے ______ "دیکھو حالات ٹھیک نہیں ہیں، ایسا نہ ہو کہ تم وہاں پھنس کر رہ جاؤ"۔

میرے والد نہیں مانے ______ اس لمحے میں اور وہ گیلری میں کھڑے تھے۔ وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی، ایک لفظ بھی نہ بولی۔ جب وہ لوگ جانے لگے تو آہستہ سے بولی ______ "میں تمہارا انتظار کروں گی"۔

میں نے دیکھا ______ اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، میں ان بھیگی آنکھوں کو ساتھ لے آیا ______ اگلے دن ہم راولپنڈی پہنچ گئے اور تین دن بعد راستے بند ہو گئے۔ سرینگر بارڈر کے اُس پار رہ گیا ______ وہ بھی بارڈر کے اس پار رہ گئی، لیکن اس کی بھیگی آنکھیں اب بھی میرے پاس ہیں، برسوں بیت گئے اس کا چہرہ دھندلا گیا۔

شاید صدیوں بعد کی بات ہے ______ ہمارے پڑوس میں نئی آوازیں سنائی دیں۔ امّی نے بتایا کہ نئے پڑوسی آ گئے ہیں۔

شام کو ہم لوگ اُن کے یہاں گئے۔ جونہی اُس نے چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں دی، میں نے اُسے پہچان لیا، لیکن اُس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ ایک لمحہ کے لیے جب اُس کی امّی میری امّی کو گھر دکھاتے اندر والے حصّہ میں لے گئیں تو میں نے پوچھا ______ "سرینگر سے کب آئیں؟"

"جی" اس نے حیرت سے کہا ______ "ہم تو کراچی سے آ رہے ہیں، میرے ابّو کی ٹرانسفر ہوئی ہے نا یہاں"۔

میں کچھ نہ بولا ______ اُسے کیسے بتاتا کہ وہ کراچی سے نہیں سرینگر سے آئی ہے۔

اگلے دن اور پھر کئی دن ــــــــ کئی بار وہ چھت پر دکھائی دی۔
بس ایک نظر دیکھتی اور سر جھکا لیتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ ماہ گزر گئے۔ اس کے ابو واپس کراچی جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ٹرانسفر کرا لی۔

آخری دن جب وہ لوگ جا رہے تھے ہم لوگوں سے ملنے آئے۔

سب لوگ ڈرائینگ روم میں چائے پی رہے تھے میں صحن کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑا جالیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً مجھے اپنے پاس کسی کے ہونے کا احساس ہوا مڑ کر دیکھا تو وہ تھی۔

"آپ ــــــــ"

"کل ہم جا رہے ہیں" اس کی آواز میں اداسی تھی۔

میں چپ رہا۔

اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کوئی چیز مجھے دی اور تیزی سے واپس چلی گئی۔ میں نے دیکھا ــــــــ سرخ گلاب کا تازہ پھول،

اگلی صبح جب وہ لوگ ٹیکسی میں سامان رکھ رہے تھے تو میں اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑا تھا ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے میری طرف دیکھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں،

یہ اداس بھیگی آنکھیں ہی تو میرا سب کچھ ہے۔

"یہاں سے بائیں طرف مڑ جائیے ــــــــ بائیں طرف" میں آپ میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اسے دوسری بار ــــــــ "بائیں طرف" کہنا پڑا۔

"جی ــــــــ اچھا اچھا" میں نے بوکھلا کر گاڑی بائیں طرف موڑی۔ ایک سائیکل والا نیچے آتے آتے بچا۔

"میں یہاں اپنی ایک عزیزہ کے گھر ٹھہری ہوں"۔

"اچھا ———" میرے پاس لفظ ہی نہیں تھے۔ پوچھتا کیا؟

"کل صبح واپس چلی جاؤں گی ——— اب دائیں طرف"۔

میں دائیں طرف مڑ گیا ——— تو کل تم واپس چلی جاؤ گی، میں

نے سوچا ——— کہاں؟

لیکن میں پوچھ نہیں سکا۔

"اب بائیں اور وہ پارک کے سامنے"۔

میں نے پارک کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ چند لمحے سر جھکائے خاموش

بیٹھی رہی، پھر اُس نے سر اُٹھایا ——— "اچھا جی ——— خدا حافظ"

میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں،

"تم نے مجھے پہچان لیا ———" میری آواز کانپ رہی تھی ——— "تو

تم نے مجھے پہچان ہی لیا"

لیکن وہ تو کب کی جا چکی تھی۔

اُداسی آہستہ آہستہ میرے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ میں نے گاڑی

سٹارٹ کی اور لمبی خاموش سڑک پر گھر کی طرف چل پڑا،

لیکن میرا گھر کہاں ہے؟

میں وہاں کبھی پہنچ بھی پاؤں گا؟

⬡⬡

# دِل زندہ رہے

بہت دنوں سے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے آس پاس سب طوطوں میں تبدیل ہو گئے ہیں، یا یوں ہوا ہے کہ ظاہری ہیئت تو آدمیوں جیسی ہے لیکن باطن طوطے کا ہو گیا ہے۔ ٹی وی، ریڈیو، اخباروں، کتابوں اور رسالوں میں سے ایک ہی آواز ابھرتی ہے ——— "میاں مٹھو"

ایک کورس میں جواب آتا ہے ——— "جی"

"چوری کھانی ہے"

"کھانی ہے"

اور چوری کھانے کے لیے سب درختوں سے نیچے اتر کر پنجروں میں داخل ہو جاتے ہیں،

کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا شخص مسکراتا ہے ——— "یہاں کوئی جبر نہیں، کوئی زبردستی نہیں، سب اپنی مرضی سے پنجرے میں آتے ہیں، دراصل انہیں درخت اب اچھے نہیں لگتے، اس لیے بہتر ہے کہ انہیں کٹوا ہی دیا جائے۔"

پنجروں میں چوری کھاتے طوطے خوشی سے ٹیں ٹیں کرتے ہیں، پروں کو پھیلاتے اور پھڑ پھڑاتے ہیں ——— "ہم کوئی قید تو نہیں، ہمارے

پر سلامت ہیں اور یہ چوری ———— "

ٹیں ٹیں اور پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے پنجرے کی تیلیاں ہلتی ہیں اور چوری کے برتن پانی کے برتنوں سے جا ٹکراتے ہیں۔

شہر کی درس گاہوں، گھروں اور محفلوں میں طوطے بنانے کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبار، رسالے اور درسی کتابیں سب اس کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں، درخت تیزی سے کٹ رہے ہیں اور پنجرے کا سائز بڑھ رہا ہے' حتیٰ کہ پورا شہر ایک پنجرہ بن گیا ہے، ایک ہی عمل ———— طوطے بنانے کا عمل کئی برسوں سے جاری ہے، صرف کنٹرول کرنے والے کی آواز اور چہرہ بدلتا ہے ————

ان طوطوں کے درمیان میں بھی ایک طوطا ہوں، لیکن ذرہ سا مختلف'

"میاں مٹھو چوری کھانی ہے"

"کھانی تو ہے لیکن تھوڑی سی اڑنے کی اجازت بھی"

ایک ہُدہُد دورانِ سفر ایک رات پریوں میں پھنس گیا، اور ان کے نشیمن میں اتر آیا۔ ہُدہُد حدتِ نظر کے لیے مشہور ہے اور پریاں اپنی کمزور بینائی کے لیے۔ اس رات ہُدہُد نے اپنا آشیانہ ان کے نشیمن میں بنایا۔ انہوں نے اس سے مختلف خبریں پوچھیں۔ رات تمام ہوئی تو ہُدہُد نے رختِ سفر باندھا اور سفر پر روانہ ہونے لگا۔ پریوں نے پوچھا ———— "اے مسکین! تو نے یہ کیا بدعت شروع کر دی ہے کہ تو دن میں عازمِ سفر ہوتا ہے؟"

ہُدہُد نے جواب دیا ———— "یہ عجب بات ہے کہ تمام کام دن ہی میں عمل میں آتے ہیں۔"

پریوں نے کہا ———— "شاید تو دیوانہ ہے، جب طلسماتی دن میں

سورج خود ظلمت پذیر ہو جاتا ہے تو کسی چیز کو تُو کیسے دیکھ سکتا ہے"؟

ہُدہُد نے کہا ——— تمہارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس جہاں میں جو نور ہے وہ نورِ خورشید کے طفیل ہے اور تمام تر روشنی اکتسابِ نور و اقتباسِ ضو پر مبنی ہے"۔

پریوں نے یہ سن کر اس پر الزام لگایا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے اور یہ کہ دن میں کسی شے کو کیوں کر دیکھا جا سکتا ہے۔

ہُدہُد نے جواب دیا ——— "ہم قیاس کے ذریعے مختلف چیزوں سے اپنا الحاق وجود میں لاتے ہیں۔ ہر کوئی ہر روز دیکھتا ہے اور دیکھو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنے آپ کو عالمِ شہود میں پاتا ہوں"۔

پریوں نے جب یہ بات سُنی تو وہ آہ و بُکا پر اتر آئیں اور ایک حشر برپا کر دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا ——— "یہ دن میں روشنی کا مدّعی ہے جب کہ آنکھوں کا منظنہ یہ ہے کہ اس وقت بینائی نہیں رہتی"۔

انہوں نے فوراً ہُدہُد کی آنکھوں پر حملہ کر دیا۔

ہُدہُد نے یہ صورت دیکھ کر سوچا کہ اگر میں اپنے مسلک سے نہیں ہٹا تو یہ مجھے مار ڈالیں گی۔ ان کا حملہ میری چشم پر ہے اور موت اور کورچشمی بیک وقت واقع ہوں گی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہا ——— "دیکھو میں نے تمہارا درجہ دریافت کر لیا ہے اور کورچشم ہو گیا ہوں"۔

اڑنے کی مشروط اجازت!

"میاں مٹھو ——— بے شک اُڑو، یہ پنجرہ بہت بڑا ہے۔ تم اس کے اندر آسانی سے اُڑ سکتے ہو"۔

پنجرے کی فضا تو آسمان جیسی ہے،

اور آسمان کا دائرہ بھی تو کناروں ہی میں محدود ہے، اور اڑان کی خواہش،
جسم کی اڑان تو اس پنجرے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہے لیکن
یہ اندر جو شے چھپی بیٹھی ہے، یہ کوئی لمبی زقند بھرنا چاہتی ہے،
ایک درویش نے دوسرے سے کہا ـــــــ "آؤ جلتے تنور میں کودیں
دیکھیں باہر کون نکلتا ہے"؟
دوسرا مسکرایا اور بولا ـــــــ "تم جلتے تنور میں سے زندہ نکلنا چاہتے
ہو میں نیستی کے سمندر میں غوطہ لگا کر باہر آنا چاہتا ہوں"۔
تو یہ گریہ کس لیے، زقند نہ لگا سکنے کی مایوسی یا زقند لگانے کی اجازت
نہ ملنے کا دُکھ،
اور یہ زقند بھی کیا چیز ہے ـــــــ کیا خواہش ہے؟
دن کو زقند کا معاملہ ہی اور ہے ـــــــ صبح سویرے کنٹرول
روم میں بیٹھا ہوا وہ ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں کے ذریعے دن بھر کے معمولات
طے کرتا ہے،
"طوطے ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں اور چُوری کھانے کے لیے باری باری
اپنی جگہ سے زقند بھریں اور اپنے اپنے پنجرے میں آجائیں"۔
طوطے ٹیں ٹیں کرتے زقندیں بھرتے اپنے اپنے پنجرے میں آتے ہیں،
گرم گرم چُوری سے اٹھتی مہک انہیں مدہوش کیے دے رہی ہے۔
اُوپر خالی آسمان باہیں پھیلائے پکارتا ہے مگر وہ نظر اٹھا کر بھی
نہیں دیکھتے۔
کنٹرول روم میں بیٹھا ہوا وہ مسکرائے جاتا ہے۔
سارے شہر میں زقند کا سماں ہے۔

ایک دو تین چار ——— ایک دو تین چار !

لیکن رات اپنی ہے ——— سر پر پھیلا آسمان ، زقند بھرنے کی خواہش چٹکیاں لیتی ہے ، لیکن یہ زقند پنجرے تک نہیں ، کھلے آسمان میں دور تک جانے ، نئے راستے تلاش کرنے کی خواہش ہے ،

میں کون ہوں ؟

کیا میں پنجرے میں بیٹھ کر چوری کھانے کے لیے ہی پیدا ہوا ہوں ۔

کنٹرول روم میں بیٹھا یہ شخص ——— یہ شخص نہیں ، اس کا کوئی چہرہ نہیں " یہ بھی ایک عمل ہے جو کئی صدیوں سے یوں ہی جاری ہے ، شہر کبھی آزاد ہوتا ہے ، کچھ دیر کے لیے ، پھر پابند ہو جاتا ہے یا یہ کہ وہ خود ہی کبھی کبھی پنجرے کو ظاہری طور پر غایب کر دیتا ہے اور کبھی وہ نظر آنے لگتا ہے ——— یہ آزادی ، یہ پابندی ——— اور ان کے درمیان میں ——— میں کون ہوں ؟

یہ میرے اندر کبھی کبھی کیا شے سرسراتی ہے ، یہ نیلے آسمان میں زقند لگا کر گم ہو جانے کی آرزو کیا ہے ؟

رات کی تنہائی میں جب چیزیں سو جاتی ہیں ، میں اپنے وجود کی فصیل پر کھڑا ہو کر ایک لمبی زقند بھرتا ہوں ۔ میرا اپنا آپ فضا میں اٹھ کر پھیلنے لگتا ہے ۔ ایک بے کراں سمندر میرے چاروں طرف ہے ، خاموش ، پُر اسرار ، وقت کی قید سے آزاد ، اربوں شمسی سالوں کے فاصلوں پر پھیلی کائنات میرے چاروں طرف موجود ہے ——— ستارے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں ۔ میں انہیں اپنے اندر سمیٹنا چاہتا ہوں ۔ لیکن میرے دامن کے کناروں کی حدود ———

——— تو یہاں بھی وہی پابندی ، یہ بھی ایک پنجرہ ہی ہے ، میرے شہر کے پنجرے سے بڑا ، فرق صرف چھوٹے بڑے ہی کا ہے ،

میں اس پر اسرار کائنات میں زقند تو لگا سکتا ہوں، مستقل طور پر وہاں نہیں رہ سکتا، زمین مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے،

رات بیت گئی ______ دن چڑھتے ہی وہی کنٹرولڈ عمل ______

میری رات بھی محدود، دن بھی طے شدہ۔

تو زقند بھرنے کی خواہش کیا ہے؟

ایک درویش نے کسی زنجیروں میں جکڑے شخص کو اس عالم میں دیکھا کہ وہ شور و غوغا کر رہا ہے۔ پوچھا کہ اتنی وزنی بیڑیوں کے باوجود تم شور مچا رہے ہو اور خاموشی اختیار نہیں کرتے۔ وہ بولا کہ بیڑیاں میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں نہ کہ میرے قلب میں!

دل زندہ رہا تو ایک دن میں بھی ایک لمبی زقند لگا کر کائنات میں ایسا گم ہوؤں گا کہ لوٹ کر نہیں آؤں گا!

بس چوری کھانے کے باوجود دِل زندہ رہے!

# ہوا کے پیچھے پیچھے

میں پچھلے کئی برسوں سے اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ گاڑی چلانے میں ایسی منہمک ہوئی ہے کہ مجھے بھول بیٹھی ہے۔ اس دوران کئی لوگ فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھے اور اتر گئے، لیکن میں اسے یاد ہی نہیں آیا یوں لگتا ہے کہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ میں بھی پیچھے بیٹھا ہوں۔

کئی برس پہلے جب وہ اور میں یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے تو ایک دن اُس نے مجھے لفٹ دی تھی۔ ہوا یوں کہ اس روز شدید بارش تھی۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا، اُسی دن نہیں میرے پاس ویسے بھی کچھ نہیں تھا، میرے مستقبل کا انحصار اسی امتحان پر تھا چنانچہ میں ہر وقت کتابوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ میرے ساتھی جب بھی کوئی تفریحی پروگرام بناتے میں کنی کترا جاتا۔ اس کی ایک وجہ تو امتحان کا خوف اور دوسرے میری حالت تھی جو زبانِ حال سے سب کچھ کہہ رہی تھی، اس لیے کوئی بھی مجھ پر توجہ نہیں دیتا تھا لیکن وہ ساری کلاس کی توجہ کا مرکز تھی۔ میں تو اسے بس دور ہی سے دیکھ دیکھ کر رہ جاتا تھا۔ اُس کے قریب جانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا ____

بس اُس روز ایسا ہوا کہ بارش تیز تھی۔ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ میں بارش سے بچنے کے لیے اپنے لنڈے کے کوٹ میں سمٹا سکڑا کونے میں دُبکا کھڑا تھا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ دوسری طرف سے نکلی۔ مجھے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رکی، چلی پھر جانے کیا سوچ کر پلٹ آئی۔

"ہمارے ساتھ آجائیں"۔

اُس کی سہیلی نے بُرا سا منہ بنایا۔ شاید اُسے یہ بات پسند نہیں آئی بارش تیز تھی، میں نے اپنے لنڈے کے کوٹ کو جسے میں نے کمبل کی طرح اوڑھ رکھا تھا، سمیٹتے ہوئے سر ہلایا اور بغیر کچھ بولے اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس وقت مجھے اپنے آپ سے ایک عجیب سی ندامت ہوئی اور یوں لگا جیسے میں دنیا کا سب سے حقیر شخص ہوں۔ بس کوئی چیز میرے اندر ٹوٹ سی گئی، لیکن تیز بارش نے بے بس کر دیا۔

اس کی سہیلی اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ گاڑی کالج کے گیٹ سے نکل کر بڑی سڑک پر آئی تو اس نے پوچھا

"آپ کہاں رہتے ہیں؟"

میں ایک لمحہ کے لیے گڑبڑا گیا، میرا گھر شہر کے ایسے حصے میں تھا جہاں بارش میں گاڑی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے کہا ——— "آپ مجھے چیرنگ کراس کے پاس اُتار دیجیے"۔

"وہاں سے کیسے جائیں گے بارش تو بہت تیز ہے"؟ اس نے شیشے میں سے، کن انکھیوں سے مجھے دیکھا۔

میں بارش میں پہلے ہی بھیگا ہوا تھا اور سردی سے کپکپا رہا تھا۔

اس کی سہیلی نے پھر منہ بنایا ——— "آپ تو شاید سبزی منڈی کی پچھلی طرف رہتے ہیں، میں ایک بار اپنی نوکرانی کو دیکھنے وہاں گئی تھی۔"

مجھے یوں لگا جیسے گاڑی کی چھت اچانک اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے اور میں تیز بارش میں بھیگ رہا ہوں۔

"تو کوئی بات نہیں، میں آپ کو وہیں اتار دوں گی" اُس نے مسکرا کر کہا۔

مجھے محسوس ہوا، اس کی مسکراہٹ میں عجب طرح کا طنز ہے،

میں نے کہا ——— "نہیں نہیں، وہاں بہت کیچڑ ہو جاتا ہے۔ گاڑی پھنس گئی تو نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"وہ تو بہت گندہ علاقہ ہے" اُس کی سہیلی نے پھر وار کیا ——— "میں تو خشک دنوں میں گئی تھی پھر بھی گاڑی سروس کرانا پڑی۔"

ایک بار پھر گاڑی کی چھت اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور کاغذ کا بنا ہوا شخص بھیگ کر گلنے لگا۔

وہ بولی ——— "گاڑی کی کوئی بات نہیں، آپ تو پہلے ہی بھیگے ہوئے ہیں، بیمار نہ پڑ جائیں۔"

میں نے جلدی سے کہا ——— "نہیں نہیں، آپ مجھے چیئرنگ کراس پر ہی اتار دیں۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔

چیئرنگ کراس پر جب میں گاڑی سے اُتر رہا تھا تو وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں بارش میں بھیگتا ہوا فٹ پاتھ پر بڑھے ایک چھجے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ وہ چند لمحے سٹیئرنگ پر بیٹھی مجھے دیکھتی رہی، پھر

اُس کی گاڑی زن سے آگے نکل گئی۔

اُسی دن کے بعد میں اُس سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اُسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے اور کلاس کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی میرے لُنڈے کے کوٹ اور بغیر استری کی پتلون کو دیکھ کر ہنستی ہے۔ ان دو سالوں میں اس نے ایک دو بار مجھ سے نوٹس مانگے، میں ٹال گیا۔ اُس کے سامنے آتے ہی مجھے یوں لگتا جیسے تیز بارش شروع ہو گئی ہے اور میں چیرنگ کراس کے فٹ پاتھ پر کھڑا بھیگ رہا ہوں اور وہ اپنی سہیلی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی مجھے دیکھ کر ہنس رہی ہے دو سال یوں بیت گئے، درختوں پر بور آئی، پھول کھلے اور مرجھا گئے۔

امتحان دے کر میں ایک چھوٹی سی ورکشاپ میں کام کرنے لگا۔ رزلٹ کی اطلاع ایک دوست سے ملی میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آیا تھا۔ دوسرے دن میں مختصر چھٹی لے کر یونیورسٹی آیا۔ بہت سے لوگ جمع تھے' وہ بھی تھی۔ میرے استاد نے جو ہمیشہ میری ہمّت بندھاتے رہتے تھے' مجھے گلے لگا لیا۔ میں جھینپا جھینپا سا سب کے درمیان کھڑا تھا سردیاں پھر آ چکی تھیں اور لُنڈے کا وہی پرانا کوٹ پھر میرا مذاق اڑا رہا تھا۔

"مبارک ہو" میں نے مڑ کر دیکھا۔

وہ تھی،

میں ایک لفظ نہیں بول سکا۔ بس اُسے دیکھتا رہا۔ یوں لگا جیسے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔

میں اسے کبھی نہیں پا سکتا، لیکن میں ہمیشہ اُس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا رہوں گا، اس انتظار میں کہ کبھی تو وہ مڑ کر دیکھے گی۔

اب مجھے یاد نہیں کہ اُس دن اور کیا کیا ہوا۔ بس یہ یاد ہے کہ جب سب جانے لگے تو اُس نے کہا ـــــ "چلیں میں آپ کو اتار دوں گی"۔

لیکن اُسی لمحہ میرے استاد آ گئے اور بولے ـــــ "میرے ساتھ چلو تمہارے لیے ایک جاب ہے"۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اُس نے مجھے دیکھا ـــــ اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

سر مجھے جس کمپنی کے منیجر کے پاس لے گئے اس نے اسی وقت مجھے رکھ لیا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر ٹریننگ کے لیے کراچی بھجوا دیا۔ چند مہینوں بعد میں مزید ٹریننگ کے لیے باہر چلا گیا۔

زندگی کی ڈگر بدل گئی۔ لیکن مجھے اب بھی یہی لگتا کہ میں ابھی تک اس کی گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا اس کے مڑ کر دیکھنے کا منتظر ہوں۔

برسوں بیت گئے، میری شادی ہو گئی، بچے ہوئے۔ میں شاید اسے بھول گیا۔ بس کبھی اچانک کوئی پرانا ساتھی مل جاتا تو یونیورسٹی کے دنوں کی باتیں تازہ ہو جاتیں۔ اس کا ذکر بھی ہوتا ـــــ لڑکوں کے بارے میں تو معلوم ہو جاتا کہ کون کہاں کہاں ہے، لیکن لڑکیوں کے بارے میں کسی کو بھی علم نہ تھا کہ کون کدھر گئی۔

برسوں بعد ـــــ یا شاید صدیوں بعد، وہ ایک دن اچانک مل گئی۔ میں ایک جنرل سٹور کے باہر بیوی کے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ سامنے آ گئی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

ایک لمحے کے لیے لگا جیسے میں بارش میں بھیگتا ہوا برآمدے کے

کونے میں دبکا کھڑا ہوں ۔ وہ میرے پاس سے گزر رہی ہے ،
گزری ــــــــــ رکی اور مڑی

"کیسے ہیں؟"
"آپ کیسی ہیں ؟"
"جی رہی ہوں ــــــــــ"

"میں تو جی بھی نہیں رہا ، ابھی تک اسی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تمہارے مڑ کر دیکھنے کا انتظار کر رہا ہوں"۔

"تم خود ہی اتر گئے تھے"۔
"کیا کرتا جہاں میں رہنا تھا وہاں کیچڑ بہت تھی"۔
"یہ کیچڑ کیا میں تو تمہارے ساتھ موت کی دلدل میں بھی اترنے کے لیے تیار تھی"۔

مجھے یوں لگا جیسے دفعتہً تیز بارش شروع ہو گئی ہے ۔ اور کاغذ سے بنا ہوا شخص بھیگ کر گلا جا رہا ہے ۔

"کس سوچ میں ہو"؟ میں چونک پڑا ۔ میری بیوی سٹور سے نکل آئی تھی ۔

میں نے سنا ــــــــــ یہی بات اس کے خاوند نے اس سے پوچھی تھی ۔ ہم دونوں چپ رہے ۔ نہ میں نے اپنی بیوی سے اس کا تعارف کروایا نہ اس نے مجھے اپنے خاوند سے ملوایا ۔

کچھ کہے بغیر ہم دونوں چپ چاپ اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے لیکن جانے سے پہلے اس نے مڑ کر مجھے دیکھا ۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں ۔

میں کچھ نہیں کہہ سکا —— کہتا بھی کیا۔
کہ اب کہنے کے لیے رہ بھی کیا گیا ہے؟

# منظر سے باہر خوشبو

صبح آنکھ کھُلی تو طبیعت میں ایک بشاشت سی تھی، خوشی بھی عجب چیز ہے غیر محسوس طریقہ سے آتی ہے اور چپکے سے چلی جاتی ہے، کبھی کبھی تو معلوم نہیں ہو پاتا کہ خوش ہونے کی وجہ کیا ہے اور کبھی کبھی ظاہری خوشی کے موقع پر بھی اُداسی جائے نہیں جاتی، بس اُس صبح بھی یہی ہوا، میں نہیں جان پایا کہ یہ بشاشت اور ہلکا پن کہاں سے آیا ہے، اس صبح ناشتہ کی میز پر بیوی سے بھی کوئی اختلافی بات نہ ہوئی، بچّوں کو اسکول چھوڑ کر دفتر آیا تو یہ بشاشت ایک گنگناہٹ میں بدل گئی تھی۔ دفتر میں کوئی خاص کام نہ تھا، خیال آیا کہ بیٹی نے بہت دنوں سے قلم ٹھیک کرانے کے لیے دیا ہُوا ہے، چلو اسے ہی ٹھیک کرالاؤں۔ اس کے لیے پرانے شہر جانا تھا۔ شہر کی پُرانی سڑکوں اور گلیوں میں ایک عجیب مزہ ہے، زندگی کی مہک اپنائیت کا احساس' میں نے چالیس سال محلّہ میں گزارے ہیں، اب ادھر جاتا ہوں تو لگتا ہے گلی نے پاؤں پکڑ لیے ہیں، نئی آبادیوں میں سکون تو ضرور ہے لیکن وہ خلوص کی گرم جوشی اور محبّت کی مہک سے خالی ہیں، کاغذی پھولوں اور اصلی پھولوں کا فرق لیکن کیا کیا جائے نام نہاد معیارِ زندگی نے ہمیں اپنی جڑوں سے علیٰحدہ کر دیا ہے، میں پُرانا گھر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بچّوں نے مجبور کر

دیا۔ یہ اولاد بھی عجیب چیز ہے، بڑے بڑے اصول پرست اس کے ہاتھوں ذلیل ہو جاتے ہیں۔ مجھے بھی ان کی ضد نے اپنی جڑوں سے علٰحدہ کر دیا ہے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے زمین سے نکال کر گملے میں لگا دیا ہے۔ رنگین منقش خوبصورت گملے میں، لیکن میری زمین ـــــــ میری وہ گندی گلی، وہ پرانا مکان، کئی بار سوتے سوتے یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھے آوازیں دے رہے ہیں، اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ میری بیوی ماڈرن اور بڑے خاندان کی ہے، میری بات سن کر کہتی ہے ـــــــ "تم ابھی تک اپنی اوقات نہیں بھولے ـــــــ" میں چپ ہو جاتا ہوں ـــــــ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی ہے، آدمی مرتے دم تک اپنے آپ کو نہیں بھول سکتا، کم از کم میں تو بالکل نہیں بھول سکتا۔ اس نئے گھر کے سجے سجائے بیڈ روم میں بھی مجھے وہ کمرہ یاد آتا ہے جس کی چھت بارش کے ساتھ ہی ٹپکنے لگتی تھی، وہاں میری مٹی ہے اور یہاں میرا معیار ـــــــ

قلم ٹھیک کرا کے میں اپنی گلی کا بھی چکر لگا آیا، طبیعت کی بشاشت اور کھل گئی۔ میں مزے مزے سے ادھر ادھر دیکھتا مین روڈ تک آپہنچا۔ آگے اشارہ بند تھا اور گاڑیوں کی ایک لمبی قطار ـــــــ موٹر سائیکل کا فائدہ یہ ہے کہ رینگ رینگ کر آگے نکلا جا سکتا ہے۔ میں بھی کھسکتا کھسکتا آگے بڑھتا رہا اور ایک سوزوکی کے پیچھے آن رکا۔ دفعتہً سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ چونک کر دیکھا سوزوکی کی چھت کھلی تھی اور اس کی سیٹوں پر دونوں طرف چار پانچ آدمی بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک سفید کپڑا ابھرا ہوا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے احساس ہو گیا کہ درمیان میں کپڑے کے نیچے کسی کی لاش پڑی ہے۔ اتنے

میں اشارہ کھل گیا اور سوزو کی تیزی سے آگے نکل گئی۔

مَن میں بشاشت کا جو پرندہ چہک رہا تھا، لمحہ بھر میں اس کی گردن ڈھلک گئی۔ موت شاید کسی ہسپتال میں ہوئی ہوگی اور اب لاش گھر لے جائی جا رہی ہے۔

گھر، جہاں جانے کون کون لاش کا منتظر ہوگا۔

بوڑھی ماں ——— سفید سر باپ۔

خوابوں کے زینے چڑھتی، بیوی ——— یا کوئی بیٹی۔

مجھے اپنی بیٹی یاد آگئی، ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے چارپائی پر میں پڑا ہوں۔

یہ موت، یہ دُکھ کیا ہے ——— کیا زندگی دُکھ ہی کا ایک طویل لمحہ ہے جس میں پل بھر کے لیے خوشی کا کوئی پرندہ چہکنے لگتا ہے، لیکن کوئی صیاد اگلے ہی لمحے اسے اپنے جال میں پکڑ لے جاتا ہے ———،

ایک پرندہ دوسرے پرندوں کے ساتھ اُڑ رہا تھا کہ کسی صیاد کے جال میں پھنس گیا۔ صیاد نے اس کے پیروں میں حلقے ڈال کر پنجرے میں بند کر دیا۔ کچھ دن تک تو اُسے تازہ فضائیں بہت یاد آئیں لیکن پھر وہ اس قید کا عادی ہوگیا لیکن ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھی آزاد ہوگئے ہیں اور اُڑنے والے ہیں لیکن ان کے پیروں کے گرد حلقے اسی طرح موجود ہیں۔ اُس نے ساتھیوں سے التجا کی کہ وہ اسے بھی آزاد کرائیں۔ پہلے تو وہ ڈرے کہ یہ صیاد ہی کی کوئی چال نہ ہو لیکن جب اُس نے بہت آہ وزاری کی اور پرانے تعلقات کا واسطہ دیا تو وہ قریب آئے اور اسے بھی کسی نہ کسی طرح پنجرے سے نکالا۔ وہ پنجرے سے باہر آیا تو پیروں کے حلقے اسی طرح تھے۔ اُس نے ساتھی پرندوں سے التجا کی کہ وہ اسے ان حلقوں سے بھی نجات دلائیں اس پر وہ بولے ——— اگر ہم کو اس پر قدرت

ہوتی تو ہم پہلے اپنے پیر اس بندھ سے آزاد کرتے۔ بس اسی آزادی پر قناعت کرو جو حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ سارے وہاں سے اُڑے۔ انہوں نے سات اونچے پہاڑ پار کیے اور آخر میں آٹھویں پہاڑ پر پہنچے جہاں ایک رحمدل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ اس کے محل میں پہنچے تو ایک نورِ جمال نظر آیا۔ ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں انہوں نے اس سے اپنی مجبوری بیان کی۔ بادشاہ نے کہا ــــــ "تمہارے پیروں کے حلقے وہی کھول سکتا ہے جس نے انہیں تمہارے پیروں میں باندھا ہے۔ اس کے لیے تمہیں اسی صیاد کے پاس واپس جانا ہو گا"

دُنیا کے بندھن دُنیا میں ہی کھُل سکتے ہیں، یہاں کی مجبوریاں، بے بسیاں تو یہیں لوٹنا پڑے گا؟

شاید وہ پرندے اُڑے ہی نہیں تھے، ان کی عقل نے پرواز کی ہو گی اور انہیں صیاد نے نہیں ان کے اپنے آپ نے شکار کیا ہو گا۔

مجھے کئی بار احساس ہوتا ہے کہ موت میرے اندر ہی کہیں چھپی بیٹھی ہے، بس کسی دن وہ ظاہر ہو جائے گی، لیکن بات اس کے ظاہر ہونے یا غالب آجانے کی نہیں بلکہ مجبوریوں اور بے بسیوں کی ہے جو ساری عمر ہمیں شکار کرتی رہتی ہیں، اور موت شاید ہمیں ان کے پنجوں سے چھٹکارہ دلاتی ہے لیکن کیا معلوم موت بھی ان کے سامنے مجبور ہو اور یہ سارا ڈرامہ اسی طرح جاری رہتا ہو۔

مجھے خیال آیا کہ یہ سارا قصور اُس سوزوکی کا ہے، یا میرے پرانے شہر جانے کا، دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ نئی آبادیوں میں رہ کر پرانی گلیوں کے خواب، کیوں جب مجھے دراصل اپنی گلی کو چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میری مٹی وہیں کی ہے۔ وہاں میری جڑیں ہیں، لیکن بے بسی ــــــ بچوں

کا مستقبل؟ ——— میری بیوی کہتی ہے۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے بھی تمہاری طرح بے بسی کے دُکھ اُٹھائیں" میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، میری اُصول پسندی کا صلہ آخر مجھے کیا ملا ہے؟

تو یہ نئی آبادی ——— سوشل تعلقات کی ایک نئی صبح اور میری زندگی کی شام۔

سوزوکی بھاگی جا رہی ہے اور لاش ———

میں سر جھٹکتا ہوں، دوسروں کے دُکھ اپنے آپ پر طاری کر لینا میری مجبوری ہے۔ کیا کروں، کہاں جاؤں؟ کہیں نہیں جا سکتا۔ بس قطرہ، قطرہ گھلنے اور بوند بوند ٹپکنے کے لیے یہیں موجود ہوں اور اپنے حصّہ کا عذاب بھگت رہا ہوں۔

صبح آنکھ کھُلے، اگر بشاشت کا پرندہ چہچہانے بھی لگے تو کیا، کسی بھی لمحہ کوئی دُکھ اپنا یا پرایا، کہیں نہ کہیں گھات لگائے بیٹھا ہے، تو پھر بشاشت کیا اور اُداسی کیا؟

سوزوکی اب گھر پہنچ چکی ہوگی اور لاش اُتاری جا رہی ہوگی!

میری بیٹی چیخ مار کر مجھ سے لپٹ جاتی ہے ——— "ہائے میرے ———!"

میں آنکھیں بند کیے سوچتا ہوں، جب جڑیں ہی کٹ جائیں، تو پھر خوشی کیا اور اُداسی کیا!

○○

# شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا

موڑ کاٹتے ہوئے دفعتہً میری نظر لوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ لگے بورڈ پر پڑی یوں لگا جیسے اُس نے مجھے آواز دی ہے۔ بورڈ پر تازہ روشنائی سے لکھا تھا ——— مزار مستان شاہ مست ——— بورڈ کے ساتھ ہی دیوار سے گزرتی پگڈنڈی ذرا آگے جا کر درختوں کے جھنڈ میں غایب ہو گئی تھی۔ میں نے بہت چاہا کہ روز کی طرح موڑ کاٹ جاؤں، لیکن جانے کیا ہوا کہ چاہتے ہوئے بھی موڑ نہ مڑ سکا۔ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے پگڈنڈی پر ہو لیا درختوں کے جھنڈ سے گزرتے ہی ایک کھلا قطعہ آ گیا جس کے بیچوں بیچ ایک قبر تھی۔ میں قبر کے سرہانے چلا گیا، دفعتہً احساس ہوا کہ کوئی میرے پاس کھڑا ہے مڑ کر دیکھا تو ایک سفید ریش، جس کی لمبی سرمئی زلفیں شانوں پر جھول رہی تھیں، سُرخ بوٹی ایسی آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے۔

مجھے حیران دیکھ کر اُس نے پوچھا ——— "کسی کو ڈھونڈھ رہے ہو؟"

میں نے کہا ——— "ہاں ——— صاحب مزار کو۔"

اس کی مسکراہٹ ہونٹوں کے کونوں سے نکل کر سارے چہرے پر پھیل گئی، چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا، کہتے ہیں ایک درویش کو

پیاس لگی، ایک دروازے پر آکر پانی طلب کیا۔ اندر سے ایک لڑکی کوزۂ آب لے کر نکلی۔ پانی پیتے ہوئے درویش کی نظر لڑکی کے چہرے پر پڑی تو دل اُس کے جمال پر فریفتہ ہوگیا۔ وہیں بیٹھ گیا، حتیٰ کہ صاحبِ خانہ آگیا۔ درویش نے کہا میرا دل ایک گلاس پانی میں مقیّد ہوگیا ہے صاحبِ خانہ نے کہا وہ میری لڑکی ہے میں اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں لیکن پہلے لباس بدل لو۔ اُس نے درویش کو حمام میں بھیج کر مکلّف پوشاک سے آراستہ کیا اور اس کا خرقہ اتار ڈالا جب رات ہوئی تو درویش اپنے وظیفے کے لیے تیار ہوا اور سوچا کہ اپنے روزانہ کے ورد سے فارغ ہوکر دلہن کی طرف ملتفت ہوؤں گا، دفعتہً اُس پر ایسا جذب طاری ہوا کہ زور زور سے چلانے لگا ——— میرا خرقہ لاؤ ——— جلد میرا خرقہ لاؤ۔ لوگوں نے متعجب ہوکر پوچھا ——— کیا ہوا؟ کہا میں نے غیر پر جو نظر ڈالی تو اس کی سزا میں میرا لباسِ محبوبیت اتر گیا۔

اے شیخ، میں تو عرصہ سے غیر کی محبّت میں ہوں، خواہشوں کا منہ زور ریلا ہے کہ اپنے ساتھ بہائے لیے جارہا ہے۔

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتی ہے ——— "لابی میں کیوں بیٹھے ہو، ہال میں چلو ناشو شروع ہونے والا ہے۔"

میں کندھے اچکاتا ہوں۔

وہ کہتی ہے ——— "ہیر کے میک اپ میں کیسی لگتی ہوں؟"

میں بے خیالی میں سر ہلاتا ہوں ——— "بہت اچھی"

تھوڑی دیر بعد وہ سٹیج پر رانجھے کے ساتھ نمودار ہو گی، اور اس کی ونجلی کی تان پر نثار ہونے کی اداکاری کرے گی، لوگ تالیں بجائیں گے اور میں ——— میں؟ ———

"شو ختم ہونے کے بعد کہیں گم نہ ہو جانا" وہ جاتے جاتے لمحہ بھر کے لیے رکتی ہے ـــــــــ "کہیں بیٹھ کر چائے پئیں گے"۔

کسی شخص نے ایک سیاہ پوش درویش سے پوچھا ـــــــ آپ نے سیاہ پوشی کیوں اختیار کی؟ درویش نے جواب دیا ـــــــ تین چیزیں ورثے میں ملی تھیں۔ فقر، علم اور شمشیر۔ شمشیر سلاطین نے لے لی مگر اس کے محل پر اُسے استعمال نہ کیا۔ علم، علماء نے اختیار کیا مگر اُسے پڑھنے پڑھانے تک ختم کر دیا۔ فقر، فقراء نے اختیار کیا مگر اسے آلۂ تمنا و حصولِ مال بنا لیا، میں اب سیاہ پوشی اختیار نہ کروں تو کیا کروں؟

رانجھے کی ونجلی کی تان پورے ہال میں گونج رہی ہے اور وہ اُس کے ارد گرد گھومتی ہوئی اس پر جھپٹی جا رہی ہے، چند لمحوں کے لیے لگتا ہے میں بھی سٹیج پر موجود ہوں، لیکن مجھے تو ونجلی بجانا ہی نہیں آتا، میں کیا کروں؟ کان چھدوا بھی لوں تو کیا؟

کسی درویش نے ایک شخص سے پوچھا ـــــــ اس شوریدہ سری سے کیا مراد ہے۔ کہا، مخلوق سے اپنے آپ کو چھپانا چاہتا ہوں۔ درویش ہنسا اور کہا ـــــــ لوگ بہت ہیں اور تو اکیلا ہے اس لیے ان سے چھپ نہ سکے گا، بہتر ہے خود کو ان پر چھوڑ دے۔

سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا ہے۔

"Best Performance" ـــــــ میرے قریب سے کوئی کہتا ہے ـــــــ "She is a Born Artist" مجھے لگتا ہے میرا وجود ہوا میں تحلیل ہو رہا ہے۔ چاروں طرف ایک سرمئی دھند چھا رہی ہے۔ لمحہ لمحہ گزر رہا ہے، شاید صدیاں بیت گئی ہیں۔

"لو تم ہال میں چھپے بیٹھے ہو، میں ساری لابی میں تمہیں ڈھونڈھ آئی"۔

کچھ لوگ ایک شخص کے درپے تھے۔ وہ ان سے بچتا، بھاگتا ایک درویش کے حجرے میں آ چھپا۔ متلاشی وہاں پہنچ گئے اور درویش سے اُس کے بارے میں پوچھا۔ درویش نے کہا ——— ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ شخص کہاں ہے؟ پوچھا ——— کہاں؟ ——— درویش بولا ——— ابھی ابھی میرے حجرے میں گیا ہے۔ متلاشی حجرے میں گئے وہاں کسی کو نہ پایا، سمجھے کہ درویش نے ان سے مذاق کیا ہے۔ غضبناک ہو کر بولے ——— سچ بتاؤ کہ اُسے کہاں دیکھا ہے۔ درویش نے قسم کھا کر کہا کہ وہ میرے حجرے میں ہے۔ متلاشی دوبارہ گئے مگر وہ شخص دکھائی نہ دیا۔ پھر سہ بارہ دیکھنے گئے۔ آخر مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ وہ شخص باہر آیا اور درویش سے بولا ——— یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہاری برکت نے مجھے ان کی نظروں سے مخفی کر دیا تھا لیکن تم نے اُن سے یہ کیوں کہا کہ میں اندر ہوں۔ درویش نے جواب دیا ——— تمہیں میری برکت نے نہیں تمہارے اپنے خوف نے مخفی کر دیا تھا، پھر میں جھوٹ کیوں بولتا؟

"کیا بات ہے تم میری جھوٹی تعریف بھی نہیں کر رہے، لوگ تو داد دے دے کر تھک گئے ہیں"۔

"ہاں تمہاری پرفارمنس اچھی تھی ——— بہت اچھی"۔

"لوگ کہہ رہے تھے میں اصلی ہیر لگتی ہوں"۔

"کاش ایسا ہوتا ———"

"کاش کیوں؟"

"پھر تم سٹیج پر نہ ہوتیں میرے ساتھ ہوتیں"

"تمہارے ساتھ تو میں اب بھی ہوں، لیکن تم یہ کیا دقیانوسی باتیں کرتے

لگتے ہو، ہاں یاد آیا ہم یہ ڈرامہ لے کر اگلے ماہ کراچی جا رہے ہیں، چلو گے"۔

"میں"

"ہاں تم"

"میں کیا کروں گا، مجھے تو بجلی بجانا ہی نہیں آتی"۔

"تو تم کان چھدوا کر فقیر بن جانا" وہ ہنستی ہے۔

"لیکن مجھے تو مانگنا بھی نہیں آتا"،

ایک بادشاہ نے کسی درویش سے کہا ——— کچھ مانگیے درویش نے کہا مجھے مانگنا نہیں آتا۔ بادشاہ نے کہا ——— تو پھر کچھ دے دیجیے۔ درویش بولا ——— افسوس میرے پاس دینے کے لیے بھی کچھ نہیں۔

"یہاں کیا لینے آئے ہو؟" لمبی زلفوں اور سرخ بوٹی ایسی آنکھوں والا سفید ریش کھلکھلائے جا رہا ہے۔

"صاحبِ مزار سے ملنے"

"لیکن وہ تو کبھی کے یہاں سے جا چکے"۔

"کہاں"؟

"مجھے کیا معلوم"؟

یوں لگتا ہے جیسے سارا منظر پانی میں ہلتے عکس کی طرح لہریں لے رہا ہے۔ کھلا قطعہ زمین، اس کے بیچوں بیچ مستان شاہ مست کی قبر کے تعوینہ کے پاس کھڑا میں اور میرے سامنے یہ سفید ریش جس کی سرمئی زلفیں شانوں پر لٹک رہی ہیں۔

یہ سب کیا ہے؟

وہ کئی دن ہوئے اپنے یونٹ کے ساتھ کراچی جا چکی ہے۔ کراچی سے اسے

گلف اور پھر شاید یورپ جانا ہے ——— شاید۔

یہ سب کیا ہے ؟

سارا منظر پانی میں پڑے عکس کی طرح جھلملاتا ہے۔

یہ قبر، میں اور سفید ریش ،

لہریں اٹھتی ہیں، ڈوب جاتی ہیں۔

میں چپ چاپ واپس مڑتا ہوں، موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے سے پہلے وہیں، سڑک پر کھڑے کھڑے، جیب سے اُس کا خط نکال کر پڑھتا ہوں —

اگلے دن دفتر سے لوٹتے ہوئے غیر شعوری طور پر اس موڑ پر میرے پاؤں بریک پر پڑتے ہیں۔ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے پگڈنڈی سے ہوتا درختوں کے جھنڈ میں جاتا ہوں لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں۔

نہ کوئی کھلی جگہ ہے نہ کوئی قبر۔

مستان شاہ مست کی قبر کہاں گئی ؟

اور وہ سفید ریش جس کے شانوں پر سرمئی لمبی زلفیں جھولتی ہیں ——— ؟

میں حیرانی اور پریشانی کے عالم میں سڑک پر آتا ہوں۔

ایک شخص پگڈنڈی کی طرف آرہا ہے۔ میں اُس سے پوچھتا ہوں

"مستان شاہ کی قبر کہاں گئی ؟" ———

"مستان شاہ کی قبر ——— کونسی قبر" وہ حیرت سے مجھے دیکھتا ہے۔

"یہاں تو کوئی قبر نہیں۔" ———

"نہیں۔" اب میں حیران ہوتا ہوں ——— "لیکن یہ پگڈنڈی"۔

"یہ پگڈنڈی تو ان درختوں سے گزر کر بڑی سڑک پر نکل جاتی ہے۔"

اور وہ بورڈ ــــــــــــــ میں مڑ کر دیکھتا ہوں ۔ وہاں کوئی بورڈ نہیں

ــــــــــــــ کسی بورڈ کا نشان بھی نہیں ،

تو یہ سب کیا ہے ؟

کھلے میں مستان شاہ مست کی قبر ، قبر کے تعویز کے ساتھ کھڑا میں اور میرے سامنے سفید ریش جس کی سرمئی لمبی زلفیں شانوں پر جھول رہی ہیں ــــــــــــــ سارا منظر پانی میں تیرتے عکس کی طرح لہر لہر ہوا جا رہا ہے ۔

موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے سے پہلے میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر جیب میں پڑے اُس کے خط سے جا لگتا ہے ۔

"مجھے معاف کر دینا ، میں اُس کی ونجلی کے سامنے RESIST نہیں کر سکی ــــــــــ !"

# سفر
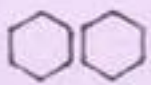
## جس سے واپسی نہ ہوئی

بہت عرصہ تک شہر سے باہر جانے کا اتفاق نہ ہو تو گھر ایک شفیق ماں کی طرح یوں اپنی گود میں سمیٹ لیتا ہے کہ چند دن کے لیے گھر چھوڑنے کے تصوّر سے بھی اداسی چھا جاتی ہے، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، پچھلے کئی برسوں سے میں شہر سے نہیں نکلا، اب دو ایک دنوں کے لیے ایک تقریب میں شرکت کے لیے گھر سے نکلنا پڑا تو طبیعت میں عجب طرح کی بے چینی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لوٹ کر نہیں آؤں گا، دل میں طرح طرح کے واہمے اور وسوسے پیدا ہو رہے تھے ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے بھی دل چاہ رہا تھا کہ سفر کا ارادہ ملتوی کر دوں۔ جوں توں کر کے فلائنگ کوچ تک پہنچا۔ کوچ جب شہر سے نکلی تو آہستہ آہستہ طبیعت سنبھلنے لگی۔ کچھ دیر بعد بھاگتی زمین اور سمٹتے پھیلتے منظروں نے اپنی گرفت میں لے لیا، احساس ہوا کہ اتنے برس شہر سے نہ نکل کر میں کئی منظروں اور تازہ ہواؤں کے ذائقوں سے محروم رہ گیا ہوں۔ تقریب دو دن میں ختم ہو گئی۔ ایک آدھ دن کی مصروفیت اور تھی۔ وہ نمٹی تو دفعتہً گھر یاد آ گیا۔ ہوا یوں کہ میں اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے کھلونے لینے بازار آیا۔ کھلونے لیتے ہوئے یوں لگا جیسے برسوں سے گھر نہیں گیا، ایک عجب طرح کی اداسی نے

چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ جلدی جلدی سامان سمیٹا اور واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

فلائنگ کوچ میں صرف فرنٹ سیٹ خالی تھی۔ مجھے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ حادثے کی صورت میں آگے بیٹھے ہوؤں کی لاشیں بھی پہچانی نہیں جاتیں اور مجھے تو اس تصوّر ہی سے خوف آتا ہے کہ مجھے بغیر پہچانے گمنامی کی حالت میں کہیں دفن کر دیا جائے، لیکن اس وقت مجبوری یہ تھی کہ اگلی کوچ کو ایک گھنٹہ بعد جانا تھا اس لیے مجبوراً ٹکٹ لے لیا۔ ڈرائیور کو شاید میرا ہی انتظار تھا۔ میں ابھی پوری طرح بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ اُس نے گاڑی چلا دی۔ بیگ سیٹ کے نیچے جما کر میں نے طائرانہ نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ دائیں طرف ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر ایک عورت اپنے دو بچّوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میری پچھلی سیٹ پر بیٹھا شخص شاید اس کا شوہر تھا، کیونکہ جس وقت میری نظر اس پر پڑی وہ اس سے سرگوشیاں کر رہی تھی ـــــــــ اس کے بعد میں نے کچھ نہیں دیکھا،

دیکھنے کے لیے تھا بھی کیا؟

اُس کا چہرہ ـــــــــ میرے بائیں طرف والے آئینہ میں پوری طرح منعکس تھا۔ ڈرائیور نے سائڈ سے گزرنے والی گاڑیوں کو دیکھنے کے لیے شیشے کو ذرا سا ٹیڑھا کیا ہوا تھا، جس کی وجہ سے پوری سیٹ اس میں سے نظر آ رہی تھی۔

برسوں پہلے ہم اسی طرح آگے پیچھے بیٹھتے تھے اور اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ وہ کلاس میں بیٹھے بیٹھے کئی بار اپنا دستی آئینہ نکال کر مجھے دیکھتی ہے دو دن ہی ایسے تھے۔

کلاس ختم ہونے کے بعد ہم گھنٹوں ورانڈے میں کھڑے، کبھی کلاس لیکچرز اور کبھی نوٹس کے تبادلے کے بہانے بے معنی گفتگو کرتے رہتے۔ جی چاہتا ساری عمر یوں ہی ایک دوسرے سے باتیں کرتے گزر جائے، لیکن وقت کا اپنا انداز اور رفتار ہے۔

ورانڈے میں کتابوں کے بہانے۔

کئی باتیں۔

کہ جن کا کوئی بھی مقصد نہیں ہے۔

مسائل جن کا کوئی بھی حل نہیں ہے۔

ذاتوں کے فرق سے طبقوں کے فرق تک یہ مسائل حل ہونے والے نہیں تھے، یا شاید ہم نے سنجیدگی سے انہیں حل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہماری ملاقاتیں تو انتظار کے اداس گیتوں سے شروع ہوتی تھیں اور اداسی اور جدائی کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں پر جا رکتی تھیں۔ کلاس کے بعد ورانڈے میں کھڑے کھڑے ایک دوسرے کو تسلی دینے کی ناکام کوششوں کے علاوہ کبھی کبھی کسی کیفے ٹیریا میں لذت و انبساط کے چند لمحے ———— بس یہی وہ یادیں تھیں جو میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں اور اس وقت بھی آئینہ سے منعکس ہو کر میرے چاروں طرف بکھر گئی تھیں۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا

کیا میرے لیے اب اس کے پاس شناسائی کی کوئی مٹھاس نہیں؟

میں نے خود سے سوال کیا

لیکن باوجود کوشش کے میں جواب نہ پا سکا

وہ اپنے دونوں بچّوں اور خاوند میں اتنی مگن تھی کہ اُس نے ایک بار

بھی میری طرف نہیں دیکھا۔

مجھے اذیت سی ہوئی۔

اتنے برسوں بعد بھی میرے سینے میں اس کی یاد کا الاؤ اسی طرح بھڑک رہا ہے اور وہ مجھے پہچانتی تک نہیں۔

میرا جی چاہا، زور زور سے چیخ کر پوچھوں ـــــــــ تم مجھے پہچانتی کیوں نہیں؟

لیکن میں جو سدا کا بزدل ہوں، اپنے اندر ڈوبا رہنے والا ایک لفظ نہ بول سکا۔

میں اس وقت بھی ایک لفظ نہیں بول سکا تھا جب اُس نے بتایا تھا کہ اس کی منگنی ہو رہی ہے۔

میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

اُس نے کہا تھا ـــــــــ "کچھ تو کرو ـــــــــ ورنہ ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔"

میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ چند دن بعد جب اُس کی چھوٹی بہن جو ہم سے ایک جماعت پیچھے تھی، اُس کی منگنی کے لڈو کلاس میں بانٹے تو میں اپنے سامنے آئے ڈبے سے بھی منہ نہ موڑ سکا۔

کلاس کے بعد اس نے مجھے کہا تھا ـــــــــ "تم نے لڈو کھا کیسے لیا؟"

میں اُسے کیسے بتاتا کہ اس طرح کے زہر تو مجھے قدم قدم پر پینا پڑتے ہیں۔ میری تو ساری زندگی ہی اپنے خوابوں کے ملبے پر کھڑے ہونے اور سنبھلنے کی کوشش کرتے گزری ہے۔

اُس دن کے بعد وہ مجھ سے دُور ہوتی گئی۔

کلاس کا اختتام ہو رہا تھا۔

میرے دوسرے بہت سے خوابوں کی طرح یہ خواب بھی، بس ایک خواب ہی بن کر رہ گیا تھا۔

ایک دن اُس نے کہا تھا ——— "چلو بھاگ چلیں"۔

میں نے سر ہلایا ——— "مجھ میں اتنی ہمّت ہوتی تو اپنے گرد اتنے سارے جہنم کیوں اکٹھے کر لیتا"۔ آخری دن آ گیا الوداعی پارٹی ہو گئی پارٹی میں اُس نے میرے قریب آنے کی بہت کوشش کی لیکن میں بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب پاس آنے کے لیے رہ بھی کیا گیا تھا میں چاہتا تھا کہ اُس سے گفتگو نہ ہو، لیکن جاتے جاتے اس نے مجھے پکڑ ہی لیا

کہنے لگی ——— "شاید یوں ہی ہونا تھا۔ لیکن تمہاری یاد ہمیشہ ایک خزانے کی طرح میرے دل میں محفوظ رہے گی"۔

اس بات کو برسوں بیت گئے ہیں۔

اور اب وہ کھلکھلا کر اپنے بچّوں اور شوہر سے باتیں کر رہی ہے۔

بائیں طرف والے آئینے میں اس کا سراپا چھلک رہا ہے۔

چہرے پر سُرخی ہے، جسم بھر گیا ہے اور کانوں میں بڑی بڑی بڑی بالیوں نے چہرے کو اور بھی نکھار دیا ہے۔

برسوں پہلے میں نے اُسے کہا تھا ——— "تم بڑی بالیاں پہنا کرو، مجھے اچھّی لگتی ہیں"۔

اور اب ان بڑی بالیوں میں وہ اچھّی لگ رہی تھی۔

لیکن اُس کا یہ سراپا، یہ حسن، اب میرے لیے نہیں۔

وہ خاوند کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسی، میں نے ذرا سا گھوم کر دیکھا۔

کتنی خوش ہے؟

ایک لمحہ کے لیے میرے اندر نفرت کا الاؤ سا بھڑکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی اس کمینگی پر خود کو لتاڑا ______ اُس کی خوشی پر خوش ہونے کی بجائے میں کیا سوچ رہا ہوں؟

یہ خیال آتے ہی ایک سکون سا ملا، لیکن اگلے ہی لمحے کسی نے میرے اندر سرگوشی کی۔

کم از کم پہچان تو لیتی، ایسی بھی بے رُخی کیا؟

میرے اندر پھر ایک الاؤ بھڑکا ______،

وہ اپنے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کسی سہانے سپنے میں کھوئی ہوئی تھی۔

لگا میری آنکھوں میں برسات امڈ آئی ہے، لیکن میں نے اُسے برسنے نہیں دیا۔ بس چپ چاپ آئینے میں اسے دیکھتا رہا۔

الاؤ آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔

میں نے خود سے کہا ______ "مجھے اس سے کیا، میں تو آج بھی اسی طرح ہوں"

اس خیال نے بچے کھچے الاؤ پر بھی پانی چھڑک دیا۔ دھواں اٹھا تو ایک سکون سا ملا۔

یہ میری پرانی عادت ہے کچھ نہ کر پاؤں تو اس دھوئیں میں پناہ لیتا ہوں دھواں میرے چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ سپنے ______ میرے اپنے سپنے، میرے

اپنے خواب چاروں طرف پھیل گئے اور تھپک تھپک کر لوریاں دینے لگے۔
بریک لگنے کے جھٹکے سے آنکھ کھلی۔ بس اڈے پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے آئینہ میں دیکھا وہ اپنا سامان ٹھیک کر رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے بیگ اٹھایا اور یوں دروازے کی طرف چلا جیسے اس جہان سے جا رہا ہوں۔
دروازے میں رش تھا۔ چند لمحوں کے لیے رکنا پڑا۔ اگلی سواریاں ہٹیں تو میں آگے بڑھا۔ دفعتہً مجھے احساس ہوا کہ کسی نے آہستگی سے میرے ہاتھ کو دبایا ہے۔
میں یکدم مڑا۔
وہ میرے بالکل پیچھے تھی۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، کرتا ______ اُس کی آنکھوں سے ایک گرم گرم موتی نکل کر میرے ہاتھ پر آن گرا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں اور میرے بازو سے ہوتی ہوئی نیچے اتر گئی۔
میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔
اور اب مجھے گھر آئے بھی کئی دن گزر چکے ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے میں ابھی تک وہیں کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ پر گرا موتی ابھی تک اُسی طرح گرم ہے اور چمک رہا ہے!

○○

# دل دریا

ایک ٹھاٹھیں مارتا دریا سامنے ہے اور پار کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں، ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسے پار کیا ہی نہ جائے اور اسی کنارے چلتے چلے جائیں شاید کہیں کوئی راستہ مل جائے یا ادھر کا کنارہ کسی دوسرے کنارے سے ہم آہنگ ہو جائے لیکن کب تک ؟ کبھی نہ کبھی تو پار جانا ہی ہوگا، دریا عبور کرنے کا خوف بلکہ اس کی تیز رفتاری کا خوف کب تک راستہ روکے رکھے گا۔ کہتے ہیں ایک پیر اپنے مریدوں کے ساتھ جنگل سے گزر رہا تھا۔ جنگل بڑا بھیانک اور خوف ناک تھا لیکن پیر اور اس کے مرید بے خوف و خطر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک رات ایک مرید کو سونے کی ایک ڈلی مل گئی۔ اس نے کسی کو بتائے بغیر اسے اپنی گٹھڑی میں چھپا لیا رات کو اسے دفعتہً احساس ہوا کہ کہیں چور ڈاکو ان پر حملہ نہ کر دیں بڑا بے چین ہوا اور اسی عالم میں اٹھ کر اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ پیر کی آنکھ کھل گئی۔ مرید کو مضطرب دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے ؟ مرید بولا حضرت ! ڈر لگ رہا ہے پیر نے تسلی دی، بیٹا ڈر کس بات کا، جاؤ سو جاؤ ! اگلے دن مرید نے پھر کہا۔ حضرت ڈر لگ رہا ہے کہیں ڈاکو ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ پیر نے کہا۔ ہمارے پاس کیا ہے، اگر حملہ کر بھی دیں تو ہمیں

کیا فکر! مُرید چپ ہو گیا لیکن شام پڑتے ہی پھر بولا۔ حضرت ڈر لگ رہا ہے۔ پیر نے ایک لمحہ کے لیے اسے دیکھا پھر بولا۔ ڈر والی چیز پھینک دو، ڈر خود بخود ختم ہو جائے گا۔

لیکن ڈر والی چیز پھینکنا کیا اتنا ہی آسان ہے اور یہ پار جانے کا خوف' اس سے کیسے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے، یہ سوچ کر کہ آدمی ساری عمر اسی کنارے رہے؛ لیکن دوسرا کنارہ آوازیں جو دیتا ہے، اس کی پکار سُن کر رات کو آنکھ کھُل جاتی ہے یوں لگتا ہے اُدھر کوئی ہے شاید اپنا ہی آپ' اور اپنے آپ سے ملنے کی تمنا رات کو جگا دیتی ہے۔ دن بھر بے چین رکھتی ہے اس تمنا کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا اور اسے پورا کرنے کی ہمت بھی نہیں۔ کئی بار سوچا کہ لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے اس بپھرتے دریا میں کُود جاؤں' پھر دیکھا جائے گا، دوسرے کنارے پر نہ پہنچا تو کہیں نہ کہیں تو پہنچ ہی جاؤں گا، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں نہ کہیں تو ادھر والے کنارے پر چلتے چلتے بھی پہنچ ہی جاؤں گا، اصل بات تو دوسرے کنارے کی ہے ایک یوگی اور ایک ویدانتی دریا کے کنارے اکٹھے ہوئے پار جانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ یوگی نے اپنے یوگ کے زور پر دریا کی لہروں پر پاؤں رکھا اور قدم قدم چلتا پار ہو گیا۔ ویدانتی اسی کنارے پر بیٹھ گیا، اس نے سوچا...... اور سوچ کی لہروں پر چلتا دریا کی اتھاہ گہرائیوں میں سے ہو آیا۔ دوسرے کنارے پہنچ کر یوگی نے طنزاً آواز دی۔ "میں تو پار اُتر لیا۔"

ویدانتی سوچ سمندر سے نکلا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ "لیکن میں اس کی گہرائیوں سے ہو آیا۔"

تو پھر یوگی کی راہ صحیح ہوئی یا ویدانتی کی؟

دوسرے کنارے جانا اہم ہے یا اس بپھرتے دریا کی تھاہ پانا؟

تو اسی کنارے چلتے جائیں، کبھی تو وہ مقام آئے گا ہی جہاں یہ بپھرتا دریا اپنے سے
بڑے کسی اور دریا میں گُم ہو جائے گا، نہ کنارے رہیں گے نہ پار اُترنے کی تمنا
لیکن اتھاہ گہرائی تو پھر بھی رہے گی جو اس دریا سے نکل کر اس سے بھی بڑے دریا
اُتر جائے گی، تو سفر یہی ہے کہ ایک دریا سے دوسرے دریا میں اور دوسرے سے
تیسرے میں، یہ کائنات بھی اپنے سے بڑی کسی دوسری کائنات کے اندر ڈوبی
بیٹھی ہے اور وہ اپنے سے بڑی کسی تیسری کے اندر اور یہ سلسلہ جانے کہاں جاکر
ختم ہوتا ہے، اور ان کے اندر چھوٹا ہوتے ہوتے میں ایک ذرّے کی طرح
لیکن یہ تو مرکزی نقطہ ہوا تو کیا میں ـــــــ میں!

روایت ہے کہ جب اسے سُولی پر چڑھایا گیا تو ابلیس آیا اور کہنے لگا
کہ ایک "انا" تُو نے کہی اور ایک "انا" میں نے کہی تھی، پھر یہ کیا بات ہے کہ تجھ پر
تو رحمت کی بارش ہوئی اور میں راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ حلاج نے جواب دیا کہ تیری
انا تیری ذات میں رہی جب کہ میں نے اسے خود سے دُور کر دیا ـــــــ تو دریا
کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کی تمنا سے بڑھ کر یہ ٹھہرا کہ اس کی اتھاہ
گہرائیوں کو جانا جائے۔

سو میں اب اس بپھرتے دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں
اور سوچتا ہوں کہ کسی دن، جب میں اس کی اتھاہ گہرائی کو پالوں گا تو اس یوگی
کی تلاش میں نکلوں گا جو اپنے یوگ کے زور پر اس کی لہروں پر چلتا دوسرے
کنارے پر جا اُترا تھا اور اس سے پوچھوں گا کہ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس
نے کیا کھویا، کیا پایا، اس کا اپنا آپ باقی بھی رہا کہ نہیں!

اس کنارے پر میں کچھ پا سکا کہ نہیں، لیکن کم از کم یہ تو ہے کہ میں موجود ہوں
ـــــــ اپنے ہونے کے احساس کے ساتھ، تو کیا یہی اس بپھرتے دریا کی اتھاہ گہرائی نہیں!

⬡⬡

رات گئے جب وہ تصویر بغل میں دبائے میرے پاس آیا تو شہر کے بڑے چوک میں جمع لوگ تتر بتر ہو چکے تھے۔ لاش کو سولی سے اتار لیا گیا تھا اور سوگواروں کو لاٹھیاں مار مار کر بھگا دیا گیا تھا۔

میرے دروازہ کھولنے پر اس نے چاروں طرف دیکھا اور تیزی سے اندر آ گیا، پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اس نے بغل میں سے تصویر نکالی اور میرے حوالے کر دی۔ میں نے خاموشی سے اخبار میں لپٹی تصویر پکڑ لی۔ وہ بغیر کچھ کہے واپس مڑا اور دروازہ کھول کر تاریک گلی میں گم ہو گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے گلی میں جھانکا اور تیزی سے دروازہ بند کر کے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں تصویر کو چھپایا جا سکے بہت سوچنے کے بعد میں نے تصویر کو پلنگ کے گدے کے نیچے رکھ دیا اور خود صوفے پر لیٹ گیا۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ تلاشی لینے والے سب سے پہلے گدے ہی کو اٹھا کر دیکھیں گے، لیکن اور کوئی جگہ تھی بھی نہیں۔ الماری میں چند کتابیں اور دو ایک آرائش کی چیزیں تھیں لکھنے کی میز بھی سامنے تھی۔ کپڑوں کی الماری میں چھپانا بھی بے سود تھا۔ لے دے کے یہی ایک جگہ تھی۔

دیکھا جائے گا ——— میں نے خود سے کہا، لیکن دوسرے ہی

ملے جب خیال آیا کہ اگر یہ تصویر میرے پاس سے برآمد ہو گئی تو میرا کیا حشر ہوگا تو سارے جسم میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔

اس تصویر کو اپنے پاس رکھنا موت کو دعوت دیتا تھا۔ کئی دنوں سے سارے شہر میں اس کی تلاش ہو رہی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح یہ تصویر ہر رات ایک نئے گھر میں منتقل ہو جاتی اور مخبر کی اطلاع پر پڑا ہوا چھاپہ ناکام رہتا۔ شہر کے بڑے چوک میں صاحبِ تصویر کی لاش سب سے اونچے کھمبے پر علی الصبح ہی لٹک جاتی۔ دن چڑھے وہاں سوگواروں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ مسلّح سپاہیوں کے دستے، ہجوم پر ٹوٹ پڑتے ہجوم کو ایک طرف سے دھکیل کر ہٹایا جاتا تو وہ دوسری طرف سے نکل آتا شام تک یہی تماشا رہتا اور جب وہ کسی نہ کسی طرح ہجوم کو چیر کر لاش کو کھمبے سے اتارتے تو رات شہر پر ٹوٹ پڑتی۔ وہ لاش کو لے کر دُور کہیں دفن کر آتے لوگ آہ و بکا کرتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے لیکن اگلی صبح جانے کیسے لاش قبر سے نکل کر سب سے اونچے کھمبے سے لٹک جاتی۔

شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ کوئی لاش قبر میں سے نکال لاتا ہے، اس پر انہوں نے اسے دفن کر کے قبر پر سخت پہرہ بٹھا دیا لیکن لاش پھر بھی نکل گئی اور کھمبے سے جا لٹکی۔ اس پر انہیں خیال آیا کہ یہ لاش کا نہیں اس کی تصویر کا کیا دھرا ہے۔ بس پھر کیا تھا وہ تصویر کی تلاش میں نکل پڑے اور انہوں نے شہر کی ہر تصویر کو چیر ڈالا کہ شاید وہ ان میں کہیں چھپی ہو لیکن اصل تصویر اُن کے ہاتھ نہ لگی۔ اس کے سوگوار ہر رات تصویر کو نئے گھر میں منتقل کر دیتے اور مخبر کی اطلاع پر پڑا چھاپہ ناکام رہتا۔

فریم میں جڑی اس تصویر پر اخبار کا کاغذ لپٹا ہوا تھا جسے موٹے دھاگے سے چاروں طرف سے اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ تصویر کی کوئی جھلک دکھائی

نہیں دیتی تھی۔ تصویر اسی طرح لپٹی لپٹائی آتی اور اگلی رات کہیں اور چلی جاتی۔ میں نے بھی تصویر اسی طرح اٹھا کر گدے کے نیچے رکھ دی تھی، اور صوفے پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ آخر کب تک تصویر کو یوں چھپایا جاتا رہے گا۔ اچھے دنوں کی امید تو اب خاک ہوئی جا رہی تھی اور تلاش کرنے والے سدھائے ہوئے کتوں کی طرح ایک ایک انچ زمین سونگھ رہے تھے —— ایک نہ ایک دن تو وہ تصویر تک پہنچ ہی جائیں گے اور پھر اچھے دنوں کا خواب بھی خواب بن کر رہ جائے گا۔

دفعتہً دروازہ پر دستک سی ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا خوف کی ایک لہر میرے سارے وجود پر پھیل گئی۔ جلدی سے ڈیوڑھی میں آیا اور دروازے کی درزوں میں سے باہر جھانکا۔

گلی سنسان پڑی تھی اور تیز ہوا دروازوں پر دستکیں دے رہی تھی۔

میں واپس کمرے میں آگیا۔

آخر کب تک تصویر کی حفاظت کرتے رہیں گے؟

کب تک؟

دفعتہً میرے دل میں ایک عجب سے خیال نے جنم لیا کہ ایک نظر اس تصویر کو دیکھوں تو سہی۔

یہ تصویر ہے کیسی؟

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کو جھٹک دیا ——

آج تک کسی نے بھی اس پر لپٹا کاغذ نہیں اتارا۔ یہ تصویر اسی طرح کاغذ میں لپٹی، بندھی ہوئی ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہو جاتی ہے۔

میں دوبارہ صوفے پر لیٹ گیا۔ لیکن بار بار کوئی اکساتا کہ ایک نظر تصویر کو دیکھوں۔ میں نے خود کو ادھر اُدھر کے خیالوں میں الجھانے کی بہت کوشش کی

لیکن ہر بار کاغذ میں لپٹی تصویر میرے سامنے آکھڑی ہوتی اور کہتی کہ مجھ پر لپٹا یہ کاغذ اتار دو، آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں دبے پاؤں ڈیوڑھی میں آیا۔ دروازہ بند تھا گلی سنسان، میں خاموشی سے کمرے میں آیا۔ کانپتے ہاتھوں سے گدا اٹھا کر تصویر نکالی۔ فریم پر اخبار لپٹا ہوا تھا اور اس کے گرد موٹے دھاگے کا جال تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ دھاگہ کھولا۔ اخبار ہٹایا۔

یوں لگا جیسے میرا سارا جسم پتھرا گیا ہے۔

یہ تو میری اپنی تصویر تھی!

⬡⬡
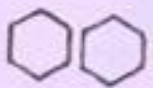
# ایک گمنام سیّاح کی ڈائری کے چند اوراق

یہ ایک گمنام سیاح کی ڈائری کے چند اوراق ہیں۔ یہ سیّاح سیاحت چھوڑ کر اس شہر میں آن بسا تھا۔ شہر کی کھدائی کے دوران یہ اوراق ایک دیوار کے نیچے سے ملے۔

## پہلا ورق

یہ عجیب شہر ہے۔ میں نے کئی شہروں کی سیاحت کی ہے لیکن اس طرح کا شہر اور اس طرح کے لوگ کہیں نہیں دیکھے اس شہر کے وسط میں ایک بڑا چوک ہے جس میں ایک مشکی گھوڑا کھڑا ہے گھوڑے کا انگ انگ پھڑک رہا ہے اور نتھنوں سے پھنکاریں نکل رہی ہیں اس پر خوبصورت زین کسا ہے اور خالی رکابیں ہر ایک شخص کو سواری کی دعوت دے رہی ہیں میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور چابکدستی سے اس کی لگامیں تھام لیں۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے۔ گھوڑے نے پچھلے سموں سے زمین کریدی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہوگیا اور سوار کو لے کر سارے شہر میں دوڑتا پھرا

ایک لمبا چکر لگا کر وہ بھرے بازاروں میں سے ہوتا ہوا اُسی چوک میں آیا اور اچھل کر سوار کو اس طرح نیچے پھینکا کہ سوار اس کے سموں تلے آکر بری طرح کچلا گیا۔ اسے کچلتے دیکھ کر لوگوں نے تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے۔ گھوڑا سوار کو کچل کر دوبارہ اپنی جگہ آکھڑا ہوا۔ اس کا پھڑکتا انگ انگ نئے سوار کو دعوت دینے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور شخص کچلے ہوئے شخص کے اوپر سے دوڑتا ہوا، اچھل کر اس پر سوار ہوگیا۔ گھوڑا اسے لے کر شہر کی سڑکوں پر ہوا ہوگیا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے۔ گھوڑا شہر کا چکر لگا کر چوک میں واپس آیا اور سوار کو نیچے گرا کر اُسے بھی اپنے پاؤں تلے کچل ڈالا۔ لوگوں نے پھر تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے ــــــ اس کے بعد ایک اور شخص کچلے ہوئے شخص پہ آکر کھڑا ہوا اور اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوگیا اور اسی طرح ایک کے بعد ایک ــــــــ،

لوگ سوار ہوتے ہوئے شخص کے لیے بھی تالیاں بجاتے ہیں اور جب وہ گھوڑے کے پاؤں تلے کچلا جا رہا ہوتا ہے تو بھی اسی طرح خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے ہیں۔

## دوسرا ورق

چند روز اس شہر میں رہنے کے بعد یہ عجب انکشاف ہوا ہے کہ اس شہر کے لوگ اگرچہ بظاہر چل پھر رہے ہیں لیکن اپاہج ہیں۔ ان کا چلنا پھرنا ایک قیاس ہے۔ وہ کب سے اپاہج ہیں مجھے معلوم نہیں۔ انہیں تو اس کا احساس بھی نہیں کہ وہ اندر سے اپاہج ہو چکے ہیں روزہ مرّہ کا کام بظاہر ٹھیک چل رہا ہے۔ سڑکوں پر چہل پہل ہے۔ دفتروں میں رونق ہے۔ ہر سمت ایک ہنگامہ ہے۔ جن بیساکھیوں پر وہ چل رہے ہیں وہ کسی کو نظر نہیں آتیں یا پھر یہ کہ

سارے شہر نے ایک خاموش سمجھوتہ کر لیا ہے :
کہ وہ ایک دوسرے کو اپاہج ہونے کا احساس نہیں دلائیں گے۔

## تیسرا ورق

کئی مہینے یہاں گزارنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ یہ شہر گفتگو کا بڑا رسیا ہے۔ گلی کوچوں، بازاروں، کلبوں، ہوٹلوں، دفتروں اور درس گاہوں میں مسلسل بحثیں ہو رہی ہیں، لیکن ان بحثوں کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ ان کے لفظ بے حرمت ہو چکے ہیں۔ اخباروں میں بڑے بڑے تنقیدی مضامین چھپتے ہیں لوگ انہیں مزے لے لے پڑھتے ہیں، ایک دوسرے کو متوجہ کراتے ہیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ یہاں جلسے اور سیمینار بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان جلسوں اور سیمیناروں میں زبردست تنقید ہوتی ہے مفید تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ ساری کارروائی یہیں تک محدود رہتی ہے شہر کی زندگی اور نظام پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گفتگو میں جذبہ بہت ہے، اتنا کہ اکثر ان بحثوں اور گفتگو میں وہ ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں لیکن نتیجہ ——— ؟

## چوتھا ورق

یہاں کا یہ عجیب دستور دیکھا کہ محسنوں کو دار پر لٹکاتے ہیں اور غداروں کی برسیاں مناتے ہیں، پھر دونوں صورتوں میں بعد میں پچھتاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے انہیں ہیرو اور غدار میں تمیز کرنا نہیں آتا۔ وہ صرف تالیاں بجاتے یا اُدھیڑ اُدھیڑ کرتے ہیں۔ یہاں سارا کام فتوؤں پر چلتا ہے۔ یہ فتوے مذہبی راہنما بھی جاری کرتے ہیں اور سیاسی راہنما بھی۔ لوگ سوچے سمجھے بغیر ان پر عمل کرتے ہیں اور بعد میں افسوس۔
اتنا عرصہ اس شہر میں رہنے کے باوجود میں معلوم نہیں کر سکا کہ اس طلسم

کے پیچھے کون جادوگر چھپا بیٹھا ہے کیئوں کا خیال ہے کہ وہ کسی دُور دیس میں رہتا ہے اور یہاں صرف اس کے کارندے ہیں کیئوں کا خیال ہے کہ وہ یہیں اندر ہی موجود ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ بس کبھی کبھی لگتا ہے کہ ان میں سے ہر شخص یہ جادوگر خود ہے، یہ خود ہی اپنے خلاف سازش کرتے ہیں اور خود ہی شور مچاتے ہیں۔ خود ہی تماشہ گر، خود ہی تماشہ اور خود ہی تماشائی۔

## پانچواں ورق

بہت دنوں سے یوں لگ رہا ہے جیسے ہر شے بے اعتبار ہو گئی ہے ذائقے پھیکے پڑ گئے ہیں، ثمر بے مٹھاس، درخت بے چھاؤں۔ موسم بے اثر اور پھول بے خوشبو، یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ ایک شوکیس میں سجا ہوا ہے کہ دید تو ہے حرکت نہیں۔

## چھٹا ورق

لوگوں کے مزاج میں ایک عجب طرح کی تندی اور غصّہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو چیر پھاڑ دینا چاہتے ہیں۔ بس کسی بہانے کی ضرورت ہے، کل زبردست جنگ ہوئی، آدھا شہر ایک طرف، آدھا دوسری طرف اس لڑائی میں انہوں نے ایک دوسرے کو یرغمال بنالیا اور اب ایک دوسرے کے یرغمالیوں کو رہا کرانے کے لیے گفتگو ہو رہی ہے۔ میں کس طرف ہوں، کچھ سمجھ نہیں آتا، لگتا ہے کسی ان دیکھی گولی پر میرا نام بھی لکھا ہوا ہے کسی دن یہ گولی کسی طرف سے آئے گی اور بس ــــــــــــ،

اس سے پہلے کہ میرے نام کی گولی مجھے تلاش کر لے میں یہ شہر

چھوڑ دوں گا ——— میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج رات خاموشی سے . . .

## آخری صفحہ

آخری صفحہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے ۔ لفظ مٹ گئے ہیں بڑی کوشش سے جو کچھ پڑھا جا سکا اور اِدھر اُدھر سے سن سنا کر جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب یہ ہے کہ سیّاح اُس رات شہر نہ چھوڑ سکا ۔ اس کے شہر چھوڑنے سے پہلے ہی آفت نے شہر کو لپیٹ میں لے لیا ۔ سُنا ہے کہ زمین کے نیچے جو بیل دنیا کو اپنے سینگ پر اٹھائے پھرتا ہے، وہ شہر والوں کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر ایسا غصّے میں آیا کہ اس نے لمحہ بھر میں شہر کو ایک سینگ سے اچھال کر دوسرے سینگ پر الٹ دیا، سب کچھ تہہ و بالا ہو گیا ۔ شہر والوں کے ساتھ سیّاح بھی مارا گیا ۔ لیکن وہ اب سیّاح کہاں رہ گیا تھا ——— وہ تو اسی شہر کا باسی بن چکا تھا ، سو سفر نامہ، سیّاح اور شہر ایک ہی انجام سے دوچار ہوئے !

# بے خوشبو عکس

داستان گو اس کہانی کو یوں سناتا ہے کہ جب میں شہر میں داخل ہوا تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، ہر طرف ایک شور اور ہنگامہ تھا۔ شہر کے کل مرد عورتیں بوڑھے جوان اور بچے ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ پکڑے بجا رہے تھے۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں ایک شیر بدحواسی کے عالم میں کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف بھاگ رہا تھا۔ جدھر جاتا ادھر سے ڈھول بجاتے ہجوم میں گھر جاتا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگ بھاگ کر شیر اتنا بدحواس ہو گیا کہ شہر کے ایک چوراہے میں آن گرا۔ آوازوں کے برستے پتھروں سے بچنے کے لیے اُس نے اپنا سر گھٹنوں میں دبا لیا، لیکن آوازیں مسلسل اُس پر ٹوٹ پڑ رہی تھیں اور آہستہ آہستہ اس کے اندر اتر رہی تھیں۔ شہر کے لوگ اب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے اور مسلسل ڈھول پیٹے جا رہے تھے، جس کے ہاتھ میں جو کچھ تھا وہ اسے بجا رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شیر بے بسی کے عالم میں کبھی اپنا سر اٹھاتا اور آوازوں کے تھپیڑوں سے گھبرا کر دوبارہ گھٹنوں میں دبا لیتا۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت بدلنے لگی اور کچھ دیر بعد یوں معلوم ہوا جیسے اس کے وجود میں سے گیدڑ جنم لے رہا

ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کے وجود میں سے مکمل گیدڑ نکل آیا۔ اس نے منہ اٹھا کر گیدڑ کی آواز نکالی اور دم دبا کر ایک گلی میں بھاگ گیا۔

شہر کے لوگ ہنستے قہقہے لگاتے اپنے اپنے ڈھول اور برتن پیٹتے گھروں کی طرف لوٹے۔

داستان گو نے ایک شخص سے پوچھا ——— "یہ کیا تماشہ ہے؟"

وہ شخص بولا ——— "اجنبی لگتے ہو"۔

داستان گو نے سر ہلایا تو وہ کہنے لگا ——— "ہم شیروں کو گیدڑ بنا دیتے ہیں"۔

پھر وہ ہنسنے لگا، لمحہ بھر توقف رہا پھر بولا ——— "جب بھی اس شہر میں کوئی شیر پیدا ہوتا ہے تو ہم سب مل کر اتنا ہونکا لگاتے ہیں کہ وہ شہر کے گلی کوچوں میں بے بسی سے دوڑنے لگتا ہے ہم اسے دوڑا دوڑا کر، اور ڈھول پیٹ پیٹ کر ایسا بے بس اور بدحواس کرتے ہیں کہ بالآخر وہ گیدڑ بن جاتا ہے"۔

داستان گو نے پوچھا ——— "اب تو اس شہر میں ایک بھی شیر نہیں ہو گا"!

اس شخص نے فخر سے سر اٹھایا ——— "ہم نے رہنے ہی نہیں دیا"۔

داستان گو بتاتا ہے کہ میں کئی دن اس شہر میں رہا اور میں نے دیکھا کہ شہر کے لوگ تماشے کے بڑے شوقین ہیں۔ انہیں دوسروں کو بے بس اور بدحواس کرنے کا ایسا چسکا پڑا ہے کہ اگر شیر نہ ملے تو اپنے ہی کسی ساتھی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس کے گرد اکٹھے ہو کر اس طرح ہو ہاؤ کرتے اور ڈھول پیٹتے ہیں کہ وہ آدمی شہر کے کسی چوراہے پر بے دم ہو کر گر پڑتا ہے وہ اس کے گرد اکٹھے

ہوجاتے ہیں اور ڈھول پیٹتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس آدمی کے قالب سے بھیڑ برآمد ہونے لگتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ آدمی سے بھیڑ بن جاتا ہے۔

داستان گو بتاتا ہے کہ اب شہر میں یا گیدڑ ہیں یا بھیڑیں شہر کے اونچے مکانوں، سجے ریستورانوں اور پر ہجوم دفاتر میں ہر طرف بھیڑیں ہی بھیڑیں یا گیدڑ ہی گیدڑ دکھائی دیتے ہیں۔ داستان گو جب کوئی سوال کرتا ہے تو وہ حیرت سے اُسے دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تُو اجنبی تو نہیں کیونکہ ہم تو سوال کرنے کی عادت ہی بھول بیٹھے ہیں۔ اور انہیں برا لگتا ہے کہ یہ سوال کرنے والا ان کے درمیان کہاں سے آگیا، سو ایک صبح انہوں نے داستان گو کو شہر بدر کر دیا کہ انہیں نہ کوئی داستان سننی تھی نہ سنانا تھی۔

داستان گو بتاتا ہے کہ شہر چھوڑنے سے پہلے میں نے شہر کی فصیل سے شہر پر آخری نظر ڈالی۔ ہر طرف ایک خاموشی تھی۔ بھیڑیں اور گیدڑ سر جھکائے اپنے روز کے کاموں میں مصروف تھے کسی کو ذرّہ بھر بھی فکر نہ تھی کہ داستان گو اس شہر سے نکالا جا رہا ہے کہ انہیں سوچنے اور سوال کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔

بس یہ آخری منظر تھا جو داستان گو نے شہر کی فصیل سے دیکھا۔

داستان گو چپ ہُوا تو میں نے پوچھا ——— "پھر کیا ہوا؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا ——— "میں وہاں سے چلا آیا اور ملک ملک دربدر کی خاک چھانتا پھرا لیکن اس شہر کو، کہ میرے دل میں بستا تھا، بھول نہ سکا۔ جی چاہتا تھا کہ وہاں لوٹ جاؤں لیکن شہر بدری کے حکم اور لوگوں کے خوف نے دل توڑ دیا تھا۔"

داستان گو خاموش ہو گیا پھر کہنے لگا ——— بعد ایک مدت کے میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور میں نے شہر لوٹنے کا ارادہ کر لیا۔ کوسوں

کی مسافتیں سمٹتا ایک صبح شہر کے دروازے پر جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دروازہ کھلا ہے اور دُور دُور تک کوئی پہرے دار دکھائی نہیں دیتا۔ حیرت زدہ ہوا کہ یا الہٰی یہ کیا ماجرہ ہے ــــــــ خیر قدرے پس و پیش کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

با حیرت ــــــــ کیا دیکھتا ہوں کہ شہر کا شہر ویران پڑا ہے اور سڑکوں گلیوں میں دھول اُڑ رہی ہے۔

الہٰی یہ کیا قصہ ہے ــــــــ شہر کے لوگ کسی نئے کھیل میں تو مشغول نہیں۔ کچھ ڈر بھی لگا کہ یہ شہر کے لوگوں کی کوئی نئی گھات نہ ہو۔ کیا معلوم شیروں کے بعد شہر کے آدمی بھی گیدڑ بن چکے ہوں اور اب وہ اجنبیوں کو گیدڑ بناتے ہوں۔ کچھ جھجکا، پھر اللہ کا نام لے کر آگے بڑھا ــــــــ بازار کے بازار سنسان پڑے تھے۔ البتہ گلیوں اور سڑکوں پر جا بجا خون کے دھبے اور کٹے ہوئے، چبائے ہوئے انسانی اعضاء دکھائی دیے۔ دل میں ڈر جاگا کہ ضرور کوئی اسرار ہے؟

ابھی اسی سوچ میں تھا کہ آگے بڑھوں یا لوٹ جاؤں کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ چونک کر آواز کی سمت بڑھا تو دیکھا کہ ایک تھڑے کے نیچے ایک شخص جس کا آدھا دھڑ کوئی چبا گیا ہے پڑا کراہتا ہے۔

قریب جا کر پوچھا ــــــــ "اے شخص یہ کیا ماجرا ہے شہر والے کیا ہوئے اور تجھ پر کیا افتاد پڑی؟"

آواز سن کر اُس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور نحیف مرتی آواز میں بولا ــــــــ "اے داستان گو میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ ہم نے تمہیں شہر بدر کیا تھا۔"

داستان گو نے کہا ــــــــ "لیکن جب مجھے شہر بدر کیا گیا تھا

اُس وقت تو شہر ہنستا بولتا تھا، ایسی کیا افتاد پڑی کہ شہر کا شہر ہی ویران ہو گیا اور اس شہر کے تماشہ بین لوگ کہاں گئے"۔

اُس شخص نے کہ زخموں سے چور اور مرنے کے قریب تھا بڑی مشکل سے کہا ——— "شہر والوں کو چسکا پڑ گیا تھا کہ شیر کو گیدڑ بنا دیتے تھے جب بھی کوئی شیر پیدا ہوتا وہ ڈھول پیٹ پیٹ کر اور شور مچا مچا کر اسے گیدڑ بنا دیتے، پھر انہوں نے اُن آدمیوں سے بھی جو ذرا سر اٹھا کر چلنا چاہتے تھے، یہی سلوک کیا۔

"پھر" ——— داستان گو نے سوال کیا،

"پھر یہ کہ شیر تو سارے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے لیکن شہر والوں کے مسلسل شور اور ڈھول پیٹنے سے آس پاس کے گیدڑ شیر بن گئے اور ایک دن وہ شہر پر ٹوٹ پڑے۔ شہر والوں نے اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا اور انہیں دیکھ کر ڈھول پیٹتے باجے بجاتے ان کے گرد اکٹھے ہو گئے لیکن ———"

"لیکن کیا؟"

"یہ کہ جوں جوں شور بڑھتا گیا اور ڈھول باجوں کی آوازیں تیز ہوتی گئیں گیدڑوں کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں، ان کا جوش بڑھتا گیا اور ایک لمحہ وہ آیا کہ وہ شیروں کی طرح دھاڑیں مارتے ہوتے لوگوں پر ٹوٹ پڑے"۔

داستان گو چپ ہو گیا۔

بہت دیر خاموشی رہی پھر داستان گو نے مجھ سے پوچھا ———

"تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں اتنے چُپ ہو"۔

میں نے کہا ——— "میرے شہر والے مجھے بھی شہر بدر کر رہے ہیں"۔

داستان گو کچھ نہیں بولا۔ ہم دونوں خاموشی سے ایک

دوسرے کو دیکھتے رہے :

کہ مقدر کے لکھے کو تو شاید ٹالا جا سکتا ہے لیکن اپنے کیے کو ٹالنا ممکن نہیں !

○○

# بیکسیِ پرواز

روایت ہے کہ وہ چھ تھے اور انہوں نے کئی دنوں کے سوچ بچار کے بعد بلا کا مقابلہ کیا جو شہر کی فصیل پر بیٹھی ہوئی تھی اور نہ کسی کو اندر آنے دیتی اور نہ کسی کو شہر سے باہر جانے دیتی۔ وہ آنے والے اور جانے والے سے ایسے سوال پوچھتی جن کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا، تب وہ اُس شخص کو مار ڈالتی چنانچہ اس خوف سے نہ کوئی شہر میں آتا اور نہ شہر سے باہر جانے کا ارادہ کرتا ــــــــــ اسی طرح بہت سے گرم دن سرد دنوں میں اور سرد دن گرم دنوں میں بدلتے گئے۔ تب ایک ایک کر کے وہ چھ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے مل کر بلا کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ــــــــــ روایت یہ ہے کہ وہ چھ تھے،

اور اب صورت یہ ہے کہ ہم پانچ ہیں اور چھٹے کا انتظار کر رہے ہیں یہ چھٹا کون ہے؟ اور کہاں ہے؟

ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن ہم پانچوں اسے تلاش کر رہے ہیں۔

صبح گھر سے نکلتے ہی میں ایک ایک چہرے کو اس امید سے ٹٹولتا ہوں کہ شاید اس میں چھٹے کی شناسائی کے کچھ پہلو مل جائیں، لیکن مجھے ابھی تک کامیابی نہیں ہوتی۔ اُدھر بلا اسی طرح شہر کی فصیل پر بیٹھی آنے جانے کے راستے

روکے ہوئے ہے۔ نہ کوئی شہر میں آتا ہے نہ جاتا ہے۔ تازہ ہوا کے سارے جھونکے مقیّد ہو چکے ہیں اور شہر مدّتوں سے باسی فضاؤں میں سانس لے رہا ہے۔ بلا سے چھٹکارہ پانے کے لیے چھ کی ضرورت ہے کہ روایت یہی ہے کہ وہ چھ تھے،

اور ـــــ اور ہم پانچ ہیں،

تو یہ چھٹا ـــــــــ

یہ چھٹا کون ہے، کہاں ہے؟

"تم تو چھٹے نہیں"؟ میں قریب سے گزرتے ایک شخص سے پوچھتا ہوں

وہ حیرت سے مجھے دیکھتا ہے ـــــ "کون چھٹا؟"

"نہیں نہیں، تم نہیں ہو" میں جلدی سے آگے بڑھ جاتا ہوں۔

تو یہ چھٹا ـــــ؟

شہر کی فصیل پر بیٹھی بلا پھیل پھیل کر سارے شہر میں اتر آئی ہے۔ ہم پانچوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور بے بسی سے کندھے اچکا اچکا کر رہ جاتے ہیں کہ ہم صرف پانچ ہیں اور روایت یہ ہے کہ وہ چھ تھے ـــــ،

میں ایک سفید ریش سے پوچھتا ہوں ـــــ "چھٹا تم میں سے تو نہیں"

وہ نفی میں سر ہلاتا ہے پھر کہتا ہے ـــــ "تم اتنے پریشان کیوں ہو، آخر ہماری نسل نے بھی تو چھٹے کے بغیر اپنی عمریں گزار ہی دی ہیں"

میں کہتا ہوں ـــــ "لیکن بلا تو وہیں ہے"،

وہ بے نیازی سے کندھے اچکاتا ہے ـــــ "تو ہوئی رہے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے"۔

"لیکن کوئی یہاں نہیں آتا، نہ باہر جاتا ہے"

"اس کی ضرورت بھی کیا ہے"؟

میں اسے اپنی بات نہیں سمجھا سکتا میں تو اپنی عمر کے لوگوں کو بھی اپنی بات نہیں سمجھا سکتا۔ وہ بھی کہتے ہیں ——— "بلا ہے تو سہی لیکن ہم کیا کریں ہم سے پہلے والے بھی یوں ہی رہ کر چلے گئے، ہم بھی چلے جائیں گے، بس یہ دنیا تو فانی ہے ایک آتا ہے دوسرا جاتا ہے۔ ایسے چل چلاؤ میں بلا کیا اور بلا کا نہ ہونا کیا۔"

اس بات کا جواب میں کیا دوں۔ کبھی کبھی تو مجھے بھی خیال آتا ہے کہ بلا کا ہونا بھی کیا اور نہ ہونا بھی کیا ——— لیکن بلا شہر کی فصیل پر موجود ہے اور پھیل پھیل کر سارے شہر میں اتر رہی ہے۔ شہر والوں کے وجود میں پتھر اگنا شروع ہو گئے ہیں۔ پہلے پاؤں کا انگوٹھا پتھر بنا پھر آہستہ آہستہ یہ پتھر سارے وجود میں پھیلنے لگا اور اب سارا شہر نصف دھڑ کے ساتھ صرف سوچتا ہے حرکت نہیں کرتا،

اب کسی کو تلاش کرنے کی بات ہی ختم ہو گئی ہے کہ ہم حرکت نہیں کرتے حرکت کے بارے میں سوچ لیتے ہیں، تو اب چھٹے کو بھی محسوس ہی کرنا پڑے گا لیکن محسوس کرنا گنتی میں نہیں آتا اور ہمیں چھ کی گنتی کرنا ہے کہ روایت میں یہی لکھا ہے کہ وہ ———،

چھٹے کی فکر میں میں رات رات بھر جاگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ اسی طرح کی ایک رات، بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا بیٹا اپنے کمرے سے آیا ——— "ابو ——— یہ آپ رات رات بھر کیا سوچتے رہتے ہیں؟"

میں کچھ دیر چپ رہا پھر کہا ——— "چھٹے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں چھ کی ضرورت ہے اور ہم پانچ ہیں۔"

میرا بیٹا چند لمحے مجھے دیکھتا رہتا ہے پھر ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہتا ہے ــــــــــ "چھٹا میں ہوں"۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے بلا کے سامنے پھینک دیا ہے اور میں اس کے سوال کے حصار میں لمحہ بہ لمحہ اس سے قریب اور قریب ہوا جا رہا ہوں۔

روایت میں آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ ان چھ نے مل کر بلا کا مقابلہ کیا اور ان میں سے ایک مارا گیا ــــــــــ،

"تو میرا بیٹا ــــــــــ" میں چپ ہو جاتا ہوں۔

اگلی صبح جب ہم پانچوں اکٹھے ہوتے ہیں تو کوئی بھی چھٹے کا ذکر نہیں کرتا۔ مجھے لگتا ہے ان میں سے ہر ایک کے بیٹے نے وہی بات کہی ہے جو رات میرے بیٹے نے کہی تھی۔

ہم پانچوں چپ ہیں۔

کوئی بھی بلا کا ذکر نہیں کرتا ــــــــــ لیکن بلا شہر کی فصیل پر موجود ہے۔ آنے جانے کے راستے بند ہیں۔ تازہ ہواؤں کو بھولا ہوا شہر اندر ہی اندر گل سڑ رہا ہے۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے ــــــــــ ہمارا کیا بنے گا؟ یہ بلا کب تک یونہی شہر کی فصیل پر بیٹھی رہے گی؟

کوئی میرے اندر سے سرگوشی کرتا ہے ــــــــــ جب تم اپنے بیٹے کی بات مان لوگے۔

مجھے اسی خیال سے جھرجھری آجاتی ہے۔

لیکن ہو سکتا ہے کسی دن میں مان ہی جاؤں لیکن کب؟ ○○

# عکسِ بے خیال

پچھلے کئی دنوں سے پرانا گھر میرا پیچھا کر رہا ہے ،
اس گھر میں میری زندگی کے بہت سے سورج طلوع اور غروب ہوئے ہیں ، میں نے زندگی کے پہلے زینہ پر وہیں قدم رکھا تھا اور جب میں وہاں سے نکلا تو زندگی کے زینے اتر رہا تھا ، وہاں کی ایک ایک دیوار پر میری خواہشوں اور تمناؤں کے نقش کھدے ہوئے ہیں ، کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے ان دیواروں ہی میں سے جنم لیا ہے ، اور کسی دن مجھے انہی دیواروں میں گُم ہو جانا ہے ، میری طرح کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دیواروں سے مکالمہ کرتے ہوں اور دیواروں کی گود میں بیٹھ کر ایک نئے جہان کی سیر کرتے ہوں ، میں نے ان دیواروں سے بہت مکالمہ کیا ہے ، اپنے جاننے ، ہونے ، پانے اور کھو جانے کے بارے میں بے شمار سوال کیے ہیں اور دیواروں نے مجھے جواب دیے ہیں ، کبھی مطمئن کرنے والے ، کبھی پیاس کو اور بڑھا دینے والے ، کبھی مایوس کر دینے والے ______ اور ان کی گود ، ایک ایسی بکل ہے جس میں گم ہو کر میں ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں ، ایک ایسی دُنیا جو یا تو میری اس ظاہری دنیا کا عکس ہے ، یا پھر یہ ظاہری دنیا اُس کا عکس ہے ______ عکس اور حقیقت کا یہ مغالطہ ، میرے ہونے یا نہ ہونے کا کھیل ، ______ ہاں یہ سب ایک کھیل ہی

ہے، جس کا تعلق میرے اس پرانے گھر سے ہے، اور اسی سے مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ انسانوں کے علاوہ چیزیں بھی جذبے رکھتی ہیں اور تعلقات بنا جانتی ہیں انسانوں کے تعلقات میں تو رشتے کی کوئی نہ کوئی نوعیت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن چیزوں کے رشتے عجیب ہیں، شاید ان کی بھی ایک روح ہوتی ہے اور یہ جو ہم پرانی چیزوں سے، آثارِ قدیمہ سے، محبت کرتے ان کی قدر دانی کرتے ہیں تو یہ اسی روح کا تسلسل ہے ——— ایک روحانی تسلسل جو نسل در نسل چلتا اور ورثے میں منتقل ہوتا ہے، لیکن جس طرح جذبے اور تعلقات اپنی کئی تہیں رکھتے ہیں، اسی طرح اس گھر کے ساتھ میرا تعلق بھی کئی طرح کا ہے، میرے بیوی بچوں کا اس سے تعلق اتنا ہی ہے کہ یہ گھر پرانے محلہ میں ہے اور اب ہماری ضرورت کے لحاظ سے رہنے کے قابل نہیں، لیکن میرا تعلق اس سے اور طرح کا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے پرانے پن اور چھوٹے سے احاطہ کے اندر ایک بڑا جہان چھپا بیٹھا ہے، میں نے اس جہان کو دریافت کر لیا ہے اور میرے بیوی بچے اسے دریافت نہیں کر سکے، چنانچہ ان کا یہ مسلسل اصرار کہ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں اس لیے گھر بدلنا چاہیئے اور یہ کہ یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں، انہیں اندرونِ شہر گندگی اور بدبو کا احساس ہوتا ہے اور مجھے اندرونِ شہر اپنائیت اور خوشبو محسوس ہوتی ہے ——— یہ بھی اپنی اپنی دریافت ہے، چیزوں سے اپنا اپنا رشتہ، اپنا اپنا مکالمہ، لیکن ایک عمر کے بعد آدمی صرف اپنا نہیں رہتا، بیوی بچوں کا ہو جاتا ہے ——— میں نے ان کی بات مان لی اور یہ گھر چھوڑ دیا۔

جس دن ہم سامان منتقل کر رہے تھے مجھے ذرّہ بھر بھی احساس نہیں تھا کہ اس گھر سے میرا رشتہ کیا ہے، اسے چھوڑتے ہوتے ایک بے اطمینانی اور اداسی ضرور تھی، لیکن پرانے پڑوسیوں سے رخصت ہونے کی رقت آمیزی اس

پر حاوی ہو گئی۔ نئے گھر کی پہلی رات، سٹیشن پر بکھرے سامان کے ساتھ گاڑی کے انتظار کی کیفیت میں گزر گئی۔ پھر ایک رات اور ——— دوسری رات شاید کئی راتیں، نئے گھر کی آسائش نیا ماحول، میں پلٹ کر پُرانے محلہ میں نہ جا سکا، لیکن کئی راتوں کے بعد، ایک رات، رات گئے کال بیل مسلسل بجتی رہی، آنکھ کھلی تو حیرت کا احساس ہوا کہ میرے سوا کوئی نہیں جاگا ——— کال بیل مسلسل بجے جا رہی تھی، مجھے لگا یہ صرف میرے لیے ہے اور اسے سن کر کوئی میرے اندر سے پکارے جا رہا ہے ——— لبیک، لبیک ——— لبیک،

میں آہستگی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر آیا ——— سامنے پرانا گھر کھڑا تھا ——— میں چپ چاپ اسے دیکھے گیا، اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا، نہ کوئی شکوہ، نہ اداسی، نہ خوشی، بس چپ چاپ کھڑا تھا، میں بھی اُس کے سامنے خاموش کھڑا رہا،

شاید ایک لمحہ بیتا ——— یا ایک صدی یا کئی صدیاں،

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے اندر سمو لیا،

وہی سیلن زدہ دیواریں، زندگی کی مہک سے لبالب، وہی بوسیدہ چھت تحفظ کے احساس سے چمکتی دمکتی، میں اپنے چھوٹے سے وجود سے نکل کر اس کی کائنات میں گم ہو گیا، اور نہ جانے کتنی دیر وہاں رہا، شاید رات کے پچھلے پہر تک، کائنات کے اختتام تک ——— ازل سے ابد تک،

اور اب یہ روز کا معمول ہے کہ رات گئے، پرانا گھر کال بیل بجاتا ہے، جسے صرف میں سُنتا ہوں، میں خاموشی سے باہر آتا ہوں اور اس کے کھلے دروازے میں داخل ہو کر ایک نئی دنیا میں جا پہنچتا ہوں ——— یہ نئی دنیا اس باغ کی طرح ہے جہاں کبھی خزاں نہیں آتی،

کہتے ہیں ایک بادشاہ کا ایک باغ تھا۔ اس میں چاروں طرف خوشبودار پودے اور ہریالی تھی، آرائش سے خالی کوئی جگہ نہ تھی۔ خوبصورت اور دلکش چشمے، قسم قسم کے طیور شاخوں کے اطراف میں خوش الحانیاں کرتے تھے اس باغ میں طاؤس بھی تھے۔ ان طاؤسوں میں سے ایک کو بادشاہ نے پکڑا اور حکم دیا کہ اس کو چمڑے میں سی دیا جائے تاکہ اس کے پروں کے نقوش ظاہر نہ ہوں اور نہ ہی وہ باوجود کوشش کے اپنے حسن وجمال کا نظارہ کر سکے۔ بادشاہ نے یہ حکم بھی دیا کہ اس کے اوپر ایک ٹوکری رکھ دی جائے۔ اس ٹوکری میں باجرے کے دانے ڈالے جائیں تاکہ وہ اس کی خوراک کا ذریعہ اور معیشت کا سامان بنیں۔ اس طرح ایک مدت بیت گئی۔ اس طاؤس نے رفتہ رفتہ وطن کو، خود کو، باغ کو، اپنے ہم دموں کو فراموش کر دیا۔ اسے سوائے اس گندے اور فضول چمڑے کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ شروع شروع میں باغ کی کشادگی، ہریالی اور خوشبو بہت یاد آتی لیکن آہستہ آہستہ ناہموار اور تاریک جگہ میں اس کا دل لگ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس ٹوکری کے پیندے سے زیادہ وسیع کوئی جگہ نہیں، لیکن کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے باغ کے پھولوں، اشجار کی خوشبو ٹوکری کے سوراخوں کے راستے اس تک پہنچتی رہتی اسے عجیب لذت حاصل ہوتی اور طبیعت میں اضطراب پیدا ہو جاتا۔ اڑنے کی لذت کا احساس ہوتا اور دل میں شوق چٹکیاں لیتا، لیکن یہ اندازہ نہ ہوتا کہ اس کے گردمنڈھے چمڑے اور ٹوکری کے علاوہ اور کیا ہے۔ عرصۂ دراز کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ اس طاؤس کو اس کے سامنے پیش کیا جائے اور اسے ٹوکری اور چمڑے سے رہائی دی جائے۔ جب اسے رہائی دی گئی تو وہ اپنے آپ کو پہچان نہ سکا اور اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ اس کا اصل روپ کیا ہے۔

وہ چمڑا منڈھا گندا بدبودار روپ،

یا یہ چمکیلے پروں والا خوبصورت انداز ،
بس ایک اسرار ہے کہ کھلتا نہیں ،
ایک کسک ، ایک تڑپ ، ایک سفر ،

دن بھر بدبودار چمڑے میں منڈھے ہوئے ٹوکری کے نیچے دانہ دانہ رزق کی تلاش ، اور رات گئے جب کوئی مسلسل کال بیل بجائے جاتا ہے ، جس کی آواز صرف میں ہی سنتا ہوں تو طاؤس ٹوکری کے نیچے سے نکلتا ہے ، بدبودار چمڑا اتارتا ہے اور وہ اپنے اصل روپ میں آجاتا ہے ،

ایک تماشا ______ مسلسل تماشا ،

لیکن یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ان میں سے حقیقت کونسی ہے ، اور خواب کون سا ؟